فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	قرآن کا معجزہ	ڈاکٹر مقبول احمد شاہد	8
قولِ نبیؐ	حاضری	افشاں نوید	12
خاص مضمون	خاندانی تعلقات کی استواری	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	16
نوائے شوق	حمد باری تعالیٰ	شمیم فاطمہ	24
	غزل	عنایت علی خان	24
	سودائے تعارف	نجمہ یاسمین یوسف	25
	غزل	شمیم فاطمہ	25
حقیقت وافسانہ	سند	قانتہ رابعہ	26
	ملائیں ہاتھ تو خوشبو.....	ربیعہ ندرت	29
	احساس	صبیحہ نبوت	34
	وقت پر کافی ہے قطرہ	توقیر عائشہ	37
انتخاب	اونچے قد کا آدمی	بشریٰ رحمان	39
سلسلہ وار کہانی	وہ ایک انداز تیرا	نصرت یوسف	45
ملاقات	محترمہ عفت قریشی سے ایک ملاقات	آسیہ راشد	52
مطالعہ گاہ	میری لائبریری سے	قانتہ رابعہ	59
ہلکا پھلکا	مرے دشمنوں کو نوید ہو	شمیم فاطمہ	63
نمایاں خواتین کا تذکرہ	شہزادی چاند سلطان	آسیہ راشد	66
سفرِ سعادت	جسے چاہا در پہ بلالیا	شاہروز بانو	70
غذا و صحت	نوزائیدہ بچے کی دیکھ بھال	ڈاکٹر ام کلثوم	75
بتول میگزین	شمیم لودھی، مریم فاروقی، ام صائم		77
منتخب کالم	یوم حجاب	اوریا مقبول جان	80

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! اس بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے والوں کے لیے حج مقبول کی دعاؤں سے آغاز کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ کی طرح یہ دعا کہ عالم اسلام کا یہ ہر سال برپا ہونے والا عظیم الشان اجتماع بحیثیت امت ہماری بیداری کا پیش خیمہ بن سکے۔ امت کو ان رہبروں سے نجات دے جو دشمن سے مل کر اپنی ہی مسلم آبادیوں کو تہ تیغ کرنے والے جابروں کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ اندرونی و بیرونی دشمنوں میں گھری ہوئی امت کے حال پر رحم فرمائے اور سنبھلنے کا موقع دے۔ آمین۔

پشاور کے گرجا گھر میں دھماکہ اور کثیر تعداد میں بے گناہوں کی ہلاکت اس ماہ کا نہیں شاید اس سال کا سب سے دلدوز سانحہ ہے۔ نوجوان، بوڑھے، مرد، عورتیں اور بچے لمحوں میں لقمۂ اجل بن گئے۔ کتنے ہی ہنستے بستے گھرانے ماتم کدوں میں بدل گئے۔ اسی ماہ کے آغاز میں پاک فوج کے میجر جنرل، کرنل اور جوان دیر کے علاقے میں بارودی سرنگ پھٹنے سے جام شہادت نوش کر گئے۔ یہ دونوں واقعات حکومت کی جانب سے طالبان سے مذاکرات کے عمل کا اعلان ہونے کے بعد پیش آئے۔

آج جبکہ وطن عزیز دہشت گردی کے بدترین دور سے گزر رہا ہے، ایسے میں مذاکرات کی پالیسی اپنانا بے شک ایک جرأت مندانہ اقدام ہے جن حالات کو ہم نے گزشتہ تیرہ برس میں خود اپنے ہاتھوں سے بگاڑا ہے، محض ایک کے بعد ایک فوجی آپریشن ان کے سدھار کا سبب نہیں بن سکتے۔ البتہ مسائل کے حل کا سرا پکڑنے کے لیے گہری بصیرت اور حکمت سے کام لینے کی ضرورت ہے تاکہ مذاکرات کا یہ عمل محض حجت تمام کرنے اور بالآخر فوجی آپریشن کے لیے جواز بنانے کا بہانہ ثابت نہ ہو۔ اس سلسلے میں دو باتیں اہم ہیں۔

پہلی یہ کہ طالبان کسی وحدت کا نام نہیں۔ شمالی علاقہ جات اور وزیرستان کے قبائلی عوام کے لیے یہ لقب استعمال کرنا اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا، کوششوں میں سنجیدگی نہ ہونے کی علامت بھی ہے اور معاملے کی نزاکت سے انکار کے مترادف بھی، وہ سب لوگ جنھیں عرفِ عام میں ''طالبان'' کہا جاتا ہے، ان میں ایک گروہ وہ ہے جو پاکستان سے نہیں، پاکستان کی امریکہ کے تلوے چاٹنے والی پالیسیوں پر ناراض ہے۔ ان میں کچھ شریعت کے نفاذ کے مخصوص مطالبات بھی رکھتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو نو برس قبل باجوڑ میں کمسن بچوں کے مدرسے پر ہونے والے میزائل حملے سے لے کر جامعہ حفصہ میں ہونے والی سفاکی اور پھر ڈرون حملوں کی صورت میں غیر انسانی سلوک پر سراپا انتقام بن چکے ہیں۔ انہی میں وہ بھی شامل ہیں جن کے نمائندوں کو دہشت گردی کی جنگ کے آغاز میں مشرف حکومت کے تحت مذاکرات کے بہانے بلا کر مروا دیا گیا۔ پھر ایک گروہ وہ ہے کہ جنگ و جدل جس کی زندگی کا عنوان ہے اور عملی طور پر جس کا کوئی مذہب نہیں ہے۔

موخر الذکر کے سوا باقی تمام گروہوں کے لیے جنگی آپریشن کرنا کئی سالوں سے معاملے کی سنگینی کو مزید بڑھانے کا سبب بن رہا ہے۔ ان گروہوں کے ساتھ مل بیٹھ کر معاملات طے کرنے چاہئیں اور ان کو رفتہ رفتہ قومی دھارے میں شامل کرنا چاہیے۔ مختلف مکاتب فکر کے علما نے بھی اپنے مشترکہ بیان میں مطالبہ کیا ہے کہ مذاکرات انہی سے کیے جائیں جو حکومت کی رٹ مانتے ہیں۔

دوسری اہم بات یہ کہ طالبان کے پردے میں ملک کے اندر غیر ملکی ایجنسیوں کی موجودگی کے جو قوی شواہد ملے ہیں، ان کی بنیاد پر قومی پالیسی اور فوجی حکمت عملی میں ضروری اور بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں اور ایسے عناصر جو کسی بھی نام سے غیر ملکی ایجنسیوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں ان کو الگ

تھلگ کر کے ان سے آہنی ہاتھ سے نپٹا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو خدانخواستہ ہم ایک اور بار 1971ء جیسے سانحے سے دوچار ہو سکتے ہیں، جب ہم نے اپنے ایک حصے کی پوری آبادی کو مکتی باہنی کے ہاتھوں میں کھیلنے دیا تھا اور پھر فوجی آپریشن کے ذریعے صورتحال پر کنٹرول حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ عبادت گاہوں پر بلاتفریق مذہب خودکش حملے اور بم دھماکے ایسے عناصر کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کا مقصد صرف پاکستان کو اندرونی طور پر کمزور کرنا ہے تاکہ بیرونی طور پر اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ پشاور ہی میں ایک کارروائی کے دوران مارے جانے والے دہشت گرد کے جسم پر مغربی جرائم پیشہ گروہ کا ٹیٹو پایا جانا اس بات کا کھلا ثبوت ہے۔ اب جبکہ تحریک طالبان نے چرچ پر حملے سے لاتعلقی ظاہر کی ہے، تو سنجیدگی سے تحقیقات کا رخ اس پہلو کی طرف موڑنا چاہیے۔

کراچی میں رینجرز کو مجرموں کے خلاف اگرچہ ابتدائی درجے کی ہی سہی مگر کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن ایم کیو ایم کے رہنما پر ہاتھ ڈالا گیا تو جیسے طوفان آ گیا اور چوبیس گھنٹوں میں اسے چھوڑ دینا پڑا۔ اس آپریشن کی کامیابی سیاسی وگروہی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر سب کو انصاف کے کٹہرے میں لانے سے مشروط ہے ورنہ کراچی میں قتل وغارت اور بھتہ خوری کو روکنا ایک خواب ہی رہے گا۔

گزشتہ دنوں آنے والے زلزلے سے بلوچستان میں خاصی تباہی ہوئی اور آواران اور کیچ میں بے حد جانی ومالی نقصان ہوا جبکہ وزیراعلیٰ بلوچستان لندن میں تشریف رکھتے تھے اور وزیراعظم نواز شریف نیویارک میں۔ عوام کا پرسانِ حال کون ہے کسے خبر!

روپے کی قیمت میں ہونے والی حالیہ مزید کمی کو خطرے کی علامت سمجھا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں مہنگائی مزید بڑھ جائے گی۔ نئی حکومت پانچ ماہ کے دوران معاشی بحران سے نمٹنے کی کوئی موثر پالیسی سامنے نہیں لا سکی۔ اس وقت خالی خزانے کو بھرنے کے لیے فوری اقدامات کے طور پر ٹیکس نادہندگان سے بھاری رقوم کی وصولی ضروری ہے مگر ہمارے ملک کے معاشی بحران کی اصل وجہ مالی بدنظمی اور کرپشن ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور سرکار کا کوئی محکمہ کرپشن سے بچا ہوا نہیں ہے۔ حکومت کی آمدنی کے ذرائع میں کرپشن کی وجہ سے اتنا ریونیو جمع نہیں ہو پاتا جو قانوناً ملک اور قوم کا حق ہے۔ اور پھر قوم کے اس پیسے کو خرچ کرنے والے ہاتھ بھی کرپٹ ہیں جن کے ذریعے قومی خزانے کا بیشتر حصہ اس قوم کا خون چوسنے والوں کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ اگر ٹیکس ایمانداری سے وصول کیے جائیں اور قوم کا پیسہ امانت سمجھ کر خرچ کیا جائے تو نہ تو وسائل کی کمی ہے، نہ ہی معاشی بحران کا کوئی امکان اور نہ قرض لینے کی ضرورت۔ پھر طویل المیعاد پالیسی کے طور پر برآمدات بڑھانے اور درآمدات کم کرنے کے لیے منصوبہ بنانا بے حد اہم ہے تاکہ روپے کی گرتی ہوئی قدر کو روکا جا سکے۔ مگر ایسا کوئی موثر پروگرام سامنے نہیں آیا۔ اب مہنگائی کی شرح میں مزید اضافہ ہماری معیشت کو کہاں لے جائے گا اور عوام پر کیا گزرے گی! بقول شاعر ؎

سن! یہ رونا نہیں گرانی کا
یہ تو بے قیمتی کا رونا ہے

لاہور میں پانچ سالہ بچی سے زیادتی کے مجرم تاحال نہیں پکڑے گئے مگر جتنا شور میڈیا پر مچایا گیا اس کے نتیجے میں اگلے چند روز کے اندر ایسے واقعات کی شرح مزید بڑھ گئی۔ یہ سزا کی بجائے جرم کی تشہیر کا منطقی نتیجہ ہے!

عیدالاضحیٰ کی مبارک باد کے ساتھ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت۔

دعا گو

صائمہ اسما

ڈاکٹر مقبول احمد شاہد

قرآن کا معجزہ

وہ کتاب جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی کتاب نہیں لائی جاسکتی، جو زبان وادب کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے اور تعلیم وحکمت کے لحاظ سے بھی

۱۰۔قرآن سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب:

قرآن کا ایک معجزہ یہ ہے کہ یہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ قرآن کا نزول ہی اس حکم کے ساتھ شروع ہوا کہ اسے پڑھا جائے (اقرأ باسم ربک الذی خلق)۔ پھر اس کے بعد جوں جوں قرآن نازل ہوتا گیا اور آیات اور سورتوں کی خاصی مقدار جمع ہوگئی تو سب سے پہلے رسول اللہؐ اور آپ کے ذریعے سے تمام مومنین کو یہ حکم دیا گیا کہ رات کی نماز کا اہتمام کریں اور اس میں قرآن کی تلاوت کریں:

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے، رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، آدھی رات، یا اس سے کچھ کم کرلو، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔'' (المزمل ۱تا۴)

اس کے بعد اگرچہ پانچ وقت کی فرض نماز کا حکم نہیں آیا تھا لیکن رات کی نماز کے علاوہ بھی نمازوں کے کچھ اوقات کی نشاندہی کر دی گئی جیسا کہ اس آیت میں ہے:

''پس اے نبیؐ جو باتیں یہ بناتے ہیں ان پر صبر کرو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اور رات کے وقت (غروب آفتاب کے بعد) اور رات کے وقت پھر اس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی۔'' (ق ۳۹تا۴۱)

اس کے بعد جب سن ۱۰ نبوی میں معراج کے موقع پر حضورؐ کو پانچ وقت کی فرض نمازوں کا حکم دے دیا گیا تو نماز کے اوقات کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

''نماز قائم کرو زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر (نماز فجر) میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور رات کو تہجد پڑھو یہ تمھارے لیے نفل ہے۔ بعید نہیں کہ تمھارا رب تمھیں مقام محمود پر فائز کردے۔''

(بنی اسرائیل ۷۸،۷۹)

ان آیات میں مجملاً یہ بتایا گیا ہے کہ پنج وقتہ نماز جو معراج کے موقع پر فرض کی گئی تھی اس کے

اوقات کی تنظیم کس طرح کی جائے۔ حکم ہوا کہ ایک نماز (فجر) تو طلوع آفتاب سے پہلے پڑھ لی جائے۔ باقی چار نمازیں (ظہر، عصر، مغرب اور عشاء) زوال آفتاب کے بعد سے رات کی سیاہی چھا جانے تک پڑھی جائیں۔ پھر اس حکم کی تشریح کے لیے جبریل علیہ السلام بھیجے گئے جنھوں نے نمازوں کے ٹھیک ٹھیک اوقات کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ (ابوداؤد، ترمذی، روایت ابن عباسؓ)

اس طرح قرآن کا نزول شروع ہونے کے ساتھ ہی اس بات کا اہتمام کر دیا گیا کہ قرآن بار بار پڑھا جائے اور نماز قرآن کے مسلسل پڑھے جانے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ اس وقت مشرق بعید میں انڈونیشیا اور جاپان سے شروع ہو کر مغرب بعید میں امریکہ کے مغربی ساحل تک ڈیڑھ ارب مسلمان آباد ہیں اور چوبیس گھنٹوں میں کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرتا جبکہ کروڑوں مسلمان کوئی نہ کوئی نماز ادا نہ کر رہے ہوں اور اس میں قرآن نہ پڑھا جا رہا ہو۔ دنیا کی کسی کتاب کو یہ شرف حاصل نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو اس میں قرآن پڑھنے کا خاص اہتمام کیا گیا اور تراویح کی نماز کی تعلیم اسی لیے دی گئی کہ رات کے قیام میں قرآن زیادہ سے زیادہ پڑھا اور سنا جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات کے ذریعے مسلمانوں کو قرآن سے تعلق پیدا کرنے اور اس کی تلاوت کرنے، اسے حفظ کرنے، سمجھنے، دوسروں کو اس کی تعلیم دینے، اس پر عمل کرنے اور خوش الحانی سے پڑھنے کی ترغیب دی۔ ذیل میں چند احادیث دی جا رہی ہیں:

☆ ابن مسعودؓ کہتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو شخص کتاب اللہ میں سے ایک حرف پڑھے تو اس کو ہر حرف کے بدلے ایک نیکی ملے گی، اور ہر نیکی دس نیکیوں کے برابر ہوگی۔ میں الم کو ایک حرف نہیں کہتا بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ (ترمذی)

☆ ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خداوند بزرگ فرماتا ہے جس شخص کو قرآن خوانی کا شغل دعا اور ذکر الٰہی سے غافل بنا دے میں اسے مانگنے والوں سے بہتر اور زیادہ دیتا ہوں اور کلام اللہ کی بزرگی دوسروں کے کلاموں پر ایسی ہے جیسے کہ میری بزرگی تمام مخلوقات پر۔ (ترمذی)

☆ براء بن عازبؓ کہتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، زینت دو تم قرآن کو اپنی آوازوں سے یعنی ترتیل اور تجوید سے قرآن پڑھو۔ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

☆ عبیدہ ملیکیؓ کہتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، اے اہل قرآن نہ تکیہ کرو تم قرآن سے یعنی اس سے غافل نہ ہو جاؤ، اور پڑھو قرآن کو رات اور دن میں جس طرح اس کو پڑھنا چاہیے یعنی خوب غور و فکر کر کے اور سمجھ کر، اور پھیلاؤ قرآن کو یعنی دوسروں کو پڑھا کر، لکھ کر، تفسیر کر کے اور لوگوں کو سنا کر۔ اور خوش آوازی سے پڑھو قرآن کو اور جو کچھ قرآن کے اندر ہے اس پر غور کرو، تاکہ تمھیں فلاح نصیب ہو۔ اور اس کے ثواب میں جلدی نہ کرو (یعنی اس کا ثواب دنیا ہی میں پا لینے کا خیال نہ کرو)۔ اس لیے کہ اس کا بڑا ثواب آخرت میں ہے۔ (بیہقی)

☆ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی آدم کے قلوب پر اسی طرح زنگ چڑھ جاتا ہے جس طرح پانی سے لوہے پر زنگ آ جاتا ہے۔ عرض کیا گیا: حضورؐ! دلوں کے اس زنگ کو دور کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: موت کو زیادہ یاد کرنا اور قرآن کی تلاوت۔ (بیہقی)

پھر مسلمانوں میں قرآن پڑھنے کا زیادہ شوق پیدا کرنے کیلیے رسول اللہؐ نے قرآن کی بہت سی سورتوں اور آیتوں کی خاص فضیلت بیان کی اور ان کو مختلف اوقات اور موقعوں پر پڑھنے کے اجر کی خوشخبری دی۔ اس طرح مسلمانوں کا قرآن سے ایک خاص تعلق پیدا کر دیا گیا جو دنیا میں کسی بھی انسانی گروہ کا کسی بھی کتاب سے نہیں ہے۔ یہ صرف قرآن کا معجزہ ہے۔

۱۱۔ قرآن بغیر سمجھے پڑھی جانے والی کتاب:

قرآن کا ایک معجزہ یہ ہے کہ دنیا میں روزانہ کروڑوں مسلمان اس کے معنی نہ سمجھنے کے باوجود اس کو پڑھتے ہیں۔ یہ شرف دنیا میں اور کسی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ اگرچہ بنیادی طور پر قرآن کتاب ہدایت ہے اور اس کو نازل کرنے کا اصل مقصد یہی ہے کہ اس کو سمجھا جائے اور اس کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزاری جائے۔ لیکن مسلمانوں کی اکثریت عربی زبان نہیں سمجھتی اور اکثر تو ان پڑھ ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود مسلمان ہونے کی وجہ سے قرآن سے ان کا تعلق کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوتا ہے اور اکثریت کا یہ تعلق ناظرہ پڑھنے تک ہی محدود ہوتا ہے۔ وہ اس کو عقیدت سے اس لیے پڑھتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔

جہاں تک اس پر عمل کرنے کا تعلق ہے، وہ اس کے بنیادی احکام اور عبادات کا طریقہ علماء سے سیکھ لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر مسلمان کے لیے یہ ممکن بھی نہیں ہے کہ وہ عربی کا اتنا علم حاصل کرے کہ قرآن سے براہ راست استفادہ کر سکے۔ لیکن ہر

پڑھا لکھا شخص اس کے اپنی مادری زبان میں تراجم اور تفاسیر سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہو تو ناظرہ قرآن پڑھنے والے کا قرآن پڑھتے وقت یہ احساس تو تازہ ہوتا ہی رہتا ہے کہ اللہ نے میری رہنمائی کے لیے یہ کتاب نازل کی ہے۔ وہ میرا رب ہے اور میں اس کا بندہ ہوں اور اس کی بندگی اور اطاعت ہی میں میری نجات ہے۔ پھر یہ احساس اس کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اہل علم لوگوں سے یہ معلوم کرتا رہے کہ اس کتاب کی تعلیمات کیا ہیں، یہ کن چیزوں کا حکم دیتی ہے اور کن باتوں سے روکتی ہے۔ پھر بغیر سمجھے قرآن پڑھنے والے لوگ قرآن کے ہر حرف پر ملنے والی نیکیوں کے تو مستحق ہو ہی جاتے ہیں۔

۱۲۔ قرآن دنیا کی واحد کتاب جو حفظ کی جاتی ہے:

قرآن کا ایک معجزہ یہ ہے کہ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جو حفظ کی جاتی ہے۔ کسی اور کتاب کو یہ شرف حاصل ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے قرآن کی جو آیات اور سورتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعے نازل ہوتی تھیں آپ کو خود بخود یاد ہو جاتی تھیں۔ یہ بھی قرآن کا اور نبی کریمؐ کا معجزہ تھا پھر ابتدائی زمانے سے ہی نماز کا حکم دے دیا گیا اور قرآن کی تلاوت نماز میں لازم قرار دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابۂ کرامؓ جو بھی قرآنی آیات نازل ہوتی تھیں وہ حفظ کر لیا کرتے تھے تاکہ نماز میں پڑھ سکیں۔ کچھ لوگوں نے قرآن کے کچھ حصے یاد کیے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ قرآن کی جو آیت بھی نازل ہو اس کو حفظ کر لیں۔ اس طرح پہلے دن سے ہی حفاظ کرام کا ایک گروہ امت مسلمہ میں پیدا ہو گیا اور اب تک موجود ہے اور ان کے ذریعے سے قرآن ہمیشہ کے لیے ہر طرح کی تحریفات سے محفوظ ہو گیا۔ دنیا بھر میں کروڑوں کی تعداد میں ایسے مسلمان موجود ہیں جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے اور وہ قرآن کو سمجھتے نہیں ہیں مگر قرآن کے حافظ ہیں۔ ان میں اکثر لوگ بچپن میں ہی قرآن حفظ کر لیتے ہیں۔

قرآن جیسی ضخیم کتاب کا زبانی یاد ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص عنایت ہے اور اسی کی مرضی سے یہ ممکن ہوا ہے۔ جیسے کہ فرمایا گیا:

''ہم نے قرآن کو ذکر کے لیے آسان کر دیا، پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا۔'' (القمر ۱۷)

ذکر کے معنی یاد کرنے اور حفظ کرنے کے بھی آتے ہیں اور کسی کلام سے نصیحت اور عبرت حاصل کرنے کے بھی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو انسانوں کے لیے ہدایت اور نصیحت کا آسان ذریعہ بنایا ہے اسی طرح اس کو حفظ کرنا بھی آسان کر دیا

ہے۔ یعنی انسانوں کی قرآن حفظ کرنے کی صلاحیت بھی قرآن کا معجزہ ہے۔ یہ صلاحیت قرآن کے علاوہ کسی اور کتاب کے لیے نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں قرآن کی آیات کو حفظ کرنے کی ترغیب دلائی ہے اور حفظ قرآن کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ذیل میں کچھ احادیث دی جارہی ہیں:

☆ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں، فرمایا رسول اللہؐ نے کہ حسد (رشک) نہ کیا جائے مگر دو شخصوں پر، ایک تو وہ شخص جس کو قرآن یاد ہو گیا اور وہ دن رات اسے پڑھتا ہے اور عبادت کرتا ہے، اور دوسرے اس شخص پر جس کو اللہ نے مال بخشا اور اس میں سے دن رات نیک کاموں پر خرچ کرتا ہے۔ (بخاری، مسلم)

☆ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ شخص جس کے دل میں قرآن میں سے کچھ نہ ہو وہ ویران گھر کی مانند ہے۔ (ترمذی)

☆ حضرت علیؓ کہتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے قرآن پڑھا اور اس کو یاد کیا، پھر اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھا تو داخل کرے گا اللہ اس کو جنت میں اور اس کے گھر والوں میں سے دس شخصوں کے حق میں اس کی سفارش قبول کی جائے گی۔ (ترمذی)

ہجرت کے بعد جب رمضان کے روزے فرض کیے گئے تو نماز تراویح کی شکل میں قیام اللیل کو رمضان کی ایک خاص عبادت قرار دیا گیا اور اس میں زیادہ سے زیادہ قرآن تلاوت کرنے کی ترغیب دی گئی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی تعلیم تھی۔ پھر حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں نماز تراویح کو خاص شکل دی گئی اور نماز تراویح کی بیس رکعتوں میں پورا قرآن ختم کرنے کو ترجیح دی گئی۔ اس کے لیے لازم تھا کہ لوگ قرآن حفظ کریں اور نماز تراویح کی امامت میں نمازیوں کو قرآن سنائیں۔ اس طرح حفظ قرآن کا یہ ادارہ ایک مستقبل حیثیت اختیار کر گیا جو اب تک قائم ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک رہے گا۔

۱۳۔ قرآن میں کہیں تضاد اور اختلاف نہیں ہے

قرآن کا ایک عظیم معجزہ یہ ہے کہ اس کے مضامین اور تعلیمات میں کہیں تضاد اور اختلاف نہیں ہے، جبکہ انسانی کلام میں ہمیشہ اختلاف پائے جاتے ہیں۔ اس طرح کے اختلافات حکومتوں کے قوانین اور فیصلوں میں اکثر ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ غالباً ۱۹۳۰ء کی بات ہے کہ امریکی کانگریس نے ایک قانون پاس کیا کہ شراب انسانی صحت کے

لیے نقصان دہ ہے اس لیے اس پر پابندی لگا دی جائے۔ اس وقت یہ پابندی لگا دی گئی لیکن چند سالوں میں ہی حکومت کو یہ قانون منسوخ کرنا پڑا۔ اب بھی امریکہ ہی کی کچھ ریاستوں میں کچھ جرائم پر سزائے موت کا قانون موجود ہے اور کچھ دوسری ریاستوں میں موت کی سزا منسوخ کر دی گئی ہے جبکہ پہلے موجود تھی۔ اسی طرح کچھ ریاستوں میں ہم جنس پرستی اور ہم جنسی شادیاں کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے اور اس سے پہلے نہیں تھی۔ جبکہ دوسری ریاستوں اور ملکوں میں اس کی اجازت نہیں ہے۔

اکثر شعراء کے کلام میں بھی تضاد پایا جانا ایک عام بات ہے۔ علامہ اقبالؒ جیسے عظیم مفکر اور شاعر کے کلام میں بھی ہمیں تضاد ملتا ہے۔ ان کے ابتدائی دور کے کلام میں وہ وطن پرستی کی ترغیب دیتے ہوئے برہمن سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

پھر جب اُنھیں حقیقت کا ادراک ہوا تو اس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مرزا غالب خود اپنے کلام میں اس تضاد کو اس طرح تسلیم کرتے ہیں۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اس کے برعکس قرآن کریم ۲۳ سال تک بتدریج نازل ہوتا رہا لیکن اس کی تعلیمات کی یکسانیت ہمیشہ قائم رہی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن انسانی کلام نہیں ہے بلکہ اللہ کا کلام ہے جو وحی کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا تھا۔ یہ بات قرآن میں اس طرح فرمائی گئی:

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔''

(النساء۸۲)

یعنی یہ کلام خود شہادت دے رہا ہے کہ یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کا کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ سالہا سال تک وہ مختلف حالات میں، مختلف مواقع پر، مختلف مضامین پر تقریریں کرتا رہے اور اول سے آخر تک اس کی ساری تقریریں ایسا ہموار، یک رنگ، متناسب مجموعہ بن جائیں جس کا کوئی جزو دوسرے جزو سے متصادم نہ ہو۔ جس میں تبدیلی رائے کا کہیں نشان تک نہ ملے۔ جس میں متکلم کے نفس کی مختلف کیفیات اپنے مختلف رنگ نہ دکھائیں اور جس پر کبھی نظر ثانی تک

کی ضرورپیش نہ آئے۔

پھر دوسری جگہ یہی بات اس طرح ارشاد فرمائی:

''اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام اتارا ہے۔ ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں، اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں۔'' (الزمر۲۳)

یعنی ان میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ پوری کتاب اول سے آخر تک ایک ہی مدعا، ایک ہی عقیدہ، اور ایک ہی نظام فکر وعمل پیش کرتی ہے۔ اس کا ہر جزو دوسرے جزو کی اور ہر مضمون دوسرے مضمون کی تصدیق وتائید اور تشریح کرتا ہے اور معنی اور بیان دونوں لحاظ سے اس میں کامل ہم آہنگی (Consistency) پائی جاتی ہے۔

(جاری ہے)

☆☆☆

حاضری

جو حج پر نہ جا سکے ان کے لیے بھی یہ دس دن اتنے ہی قیمتی ہیں جتنا حاجیوں کے لیے

مسز شجاع کے گھر مہمانوں کی آمد و رفت زوروں پر تھی۔ دو روز بعد وہ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے روانہ ہو جائیں گی۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں پرچے تھے جن میں ان کے عزیزوں کے نام اور حاجتیں، کچھ پیسے لے کر اس خواہش کے ساتھ کہ وہاں کے کبوتروں کو دانہ ڈال دیا جائے۔ شکورہ بی بی جن کے پاس نہ پیسے تھے نہ خرچہ، حسرت و یاس کی تصویر بنی مسز شجاع کو ٹکٹکی باندھے دیکھے چلی جا رہی تھیں۔ پیسہ پیسہ جمع کر کے رکھا تھا حج کے لیے مگر ہر سال کوئی ایسا عذر آ جاتا کہ جا ہی نہ پاتی ..... پچھلے برس عین شوال میں جب جانے میں صرف پندرہ روز باقی تھے کمر میں ایسی تکلیف ہوئی کہ ڈاکٹر نے سفر کی اجازت ہی نہ دی۔ وہ سوچے جا رہی تھیں کہ ایسا کیا ہے کہ رب انھیں اجازت نہیں دیتا.....ان کا بلاوا ہی نہیں آتا!!

کس قدر محروم ہیں وہ.....اور کیسی خوش بخت ہیں مسز شجاع جو ہر ایک سے اس گھر کی حاضری کا پروانہ ملنے پر مبارک بادیں وصول کر رہی ہیں.....ایک شکورہ بی بی کیا ہزاروں ایسے ہیں جو بلاوے کے منتظر ہیں..... مگر یہ کیسے ثابت ہوا کہ وہ ''حقیقی محرومین'' میں ہیں؟ اور کیا اس کی بھی کیا ضمانت ہے کہ ہر اک کا ''حج مبرور'' اور ''سعی مشکور'' ٹھہرے؟ یہ اس کے فیصلے ہیں اور اس کے فیصلوں پر مطمئن رہنا راضی بہ رضا رہنا بندے کی مومنانہ شان ہے۔ جو حج پر نہ جا سکے ان کے لیے بھی یہ دس دن اتنے ہی قیمتی ہیں جتنا حاجیوں کے لیے۔ مطلوب رب کی رضا ہو تو رب تو بن مانے بھی عطا کرتا رہتا ہے اور مانگنے والوں کی تو شان ہی عجب ہے اس کے در پر!

حضرت عباسؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ذی الحج کے ابتدائی دس دنوں کے مقابلے میں دوسرے کوئی ایام ایسے نہیں ہیں جن میں نیک عمل اللہ کو ان دنوں سے زیادہ محبوب ہو۔ صحابہ کرامؓ نے سوال کیا ''اللہ کی راہ میں جہاد کرنا بھی نہیں؟'' آپؐ نے فرمایا ''اللہ کی راہ میں جہاد کرنا بھی نہیں سوائے اس مجاہد کے جو اپنی جان و مال لے کر نکلا اور پھر واپس نہیں آیا۔'' (ترمذی)

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ کو عمل صالح جتنا ان دس دنوں میں محبوب ہے اتنا کسی دوسرے دن میں نہیں۔''

جو اعمال احادیث کی روشنی میں خاص فضیلت کے حامل ہیں وہ درج ذیل ہیں:

☆ پورے عشرے میں تکبیراتِ تشریق کا پڑھنا مسنون عمل ہے۔ مرد با آواز بلند اور خواتین پست آواز میں مسلسل ان تکبیرات کا ورد کریں۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ واللہ اکبر وللہ الحمد۔

☆ آپؐ سے یومِ عرفات کے روزے کی فضیلت کا پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''اس دن کا روزہ گزشتہ سال اور آنے والے سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔'' (مسلم)

حضرت حفصہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ چار عمل کبھی ترک نہیں فرماتے تھے۔ ''عشرہ ذی الحج کے ۹ روزے، عاشورہ کا روزہ، ایام بیض یعنی ہر ماہ کی ۱۲، ۱۳، ۱۴ تاریخ کے روزے اور فجر کی نماز سے قبل کی دو سنتیں۔'' (مسلم)

☆ ۸ ذی الحج کو فجر کے بعد ایک مرتبہ درج بالا تسبیح پڑھیں اور ۱۲ ذی الحج بعد نماز عصر تک ہر فرض نماز کے بعد یہ تسبیح پڑھنا مسنون ہے۔

☆ آپؐ نے فرمایا: ''یوم عرفہ سے افضل کوئی دن نہیں اللہ تعالیٰ عرفہ کے دن اپنے بندوں پر نظر فرماتا ہے تو جس دل میں ذرا بھی ایمان ہو بخش دیا جاتا ہے۔'' ایک صحابیؓ نے پوچھا ''یہ بخشش تمام لوگوں کے لیے ہے یا اہل عرفات کے ساتھ مخصوص ہے؟'' فرمایا ''یہ مغفرت تمام لوگوں کے لیے ہے یوم عرفہ سے زیادہ دوزخ سے رہائی کا کوئی دوسرا دن نہیں۔ اس دن سب سے زیادہ مجرم دوزخ سے رہائی پاتے ہیں۔''

☆ ۱۰ ذی الحج۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ نے قربانی کا شرف صرف حاجیوں کے لیے مخصوص نہیں رکھا بلکہ تمام مسلمانوں کو قربانی کا حکم دیا گیا کہ وہ بھی حاجیوں کے ساتھ ساتھ اسوۂ ابراہیمیؑ کی یاد تازہ کریں اور مقصد محض زیادہ گوشت کا حصول اور نت نئے کھانوں کا شوق نہ دامن گیر ہو کہ گوشت کی فراوانی لذت کام و دہن کو چار چاند لگا دے گی۔ بلکہ مقصد اس قربانی کی یاد کہ اگر مجھے بیٹے کی قربانی کا حکم دیا جاتا تو کیا میں اسوۂ ابراہیمیؑ پر پورا اتر سکتی تھی۔ سو اس کے بدلے جانور کو قربان کرتے ہوئے خود سے عہد کریں کہ اپنی ناجائز خواہشوں کو ہر صورت میں قربان کرنا ہے۔

قربانی اگرچہ فرض نہیں ہے لیکن سنت واجب کا درجہ رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ ''اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔'' (سورۃ الکوثر)

آپؐ نے فرمایا'' جسے قربانی کی وسعت اور طاقت حاصل ہو اور قربانی نہ کرے وہ مسلمانوں کی عیدگاہ میں حاضر نہ ہو۔'' (ابن ماجہ)

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر آزاد مسلمان اور مقیم پر جو صاحب نصاب ہو قربانی واجب ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک ہر مالدار پر واجب اور فقیر کے لیے سنت ہے۔

قربانی کے واجب ہونے کے لیے فقہا درج ذیل شرائط لازم قرار دیتے ہیں:

(۱) مسلمان، (۲) مقیم، (۳) بالغ، (۴) عاقل، (۵) آزاد، (۶) صاحب نصاب۔

اس حکم میں مرد اور عورت میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ صاحب نصاب اپنی خوشی سے بیوی اور بچوں کی طرف سے قربانی کر سکتا ہے مگر ان کی طرف سے واجب نہیں ہے۔ ایک گھر میں جتنے صاحب نصاب ہیں سب پر قربانی واجب ہے۔ (نصاب سے مراد کم از کم ساڑھے سات تولہ سونا، ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کے برابر تجارتی سامان یا اس کے برابر رقم ہے)۔

خواتین صاحب نصاب نہ بھی ہوں اور استطاعت رکھتی ہوں تو انھیں سال بھر کے گناہوں کے کفارے اور نیکیوں میں سبقت لے جانے کے جذبے سے اپنے اور اپنے رشتہ داروں (مرحومین) کی طرف سے قربانی کرنا چاہیے۔ البتہ اس میں شوہر کی رضا مندی پیش نظر رہے۔

ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی پاکؐ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا: ''فاطمہ اٹھو آ وَ اپنی قربانی کے جانور کے پاس کھڑی ہو اس لیے کہ اس کا جو قطرہ بھی زمین پر گرے گا اس کے بدلے میں خدا تمھارے پچھلے گناہ بخش دے گا۔'' حضرت فاطمہؓ نے پوچھا: ''یہ خوشخبری ہم اہل بیت کے لیے مخصوص ہے یا ساری امت کے لیے؟'' فرمایا: ''اہل بیت کے لیے بھی اور ساری امت کے لیے بھی۔'' (آسان فقہ حصہ دوم، ص ۳۱۷)

حفصہؓ بنت سیرین روایت کرتی ہیں ''آپؐ نے ہم کو عید کے دن نکلنے کا حکم دیا تھا یہاں تک کہ کنواری عورت بھی پردے میں نکلتی اور حائضہ بھی نکلتی وہ پیچھے رہتی۔ ہم مردوں کے ساتھ تکبریں کہتیں اور ان کی دعا میں شریک ہوتیں اس دن کی برکت اور پاکیزگی حاصل کرنے کی امید رکھتیں۔'' (بخاری، کتاب العیدین، باب ۶۱۵)

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپؐ نے عید کی نماز پڑھانے اور خطبہ دینے کے بعد عورتوں کی طرف آ کر انھیں وعظ و نصیحت کی اور فرمایا: ''صدقہ کیا کرو کیونکہ تم میں سے اکثر جہنم کا ایندھن ہو۔'' عورتوں کے نچلے حصے میں سے ایک سیاہ رخساروں والی عورت کھڑی ہوئی اور بولی ''کیوں یا رسول اللہ؟'' آپؐ نے فرمایا ''تم بکثرت شکایت کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو۔'' حضرت جابرؓ کہتے ہیں پھر عورتوں نے اپنے زیورات کو صدقہ کرنا شروع کر دیا اور حضرت بلالؓ کے کپڑے میں اپنی بالیاں ڈالنے لگیں۔ (صحیح مسلم)

اگر ہماری عبادات صرف رسوم و رواج بن جائیں تو وہ زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتیں۔ آج ہم نے

عبادات کو ایک بے جان عادت بنا دیا ہے۔ شیخ عثمان المحجوب)
بن علی ہجویری کشف المحجوب میں فرماتے ہیں ''ایک
صاحب جنید بغدادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور
پوچھا'' کہاں سے آ رہے ہو'' جواب ملا'' حج سے واپس
آ رہا ہوں۔'' پوچھا'' حج کر چکے؟'' عرض کیا'' کر
چکا۔'' پوچھا:'' جس وقت گھر سے روانہ ہوئے اور
عزیزوں سے جدا ہوئے اپنے تمام گناہوں سے بھی
مفارقت کی نیت کر لی تھی؟'' کہا'' نہیں'' فرمایا'' بس
پھر سفر پر روانہ ہی نہیں ہوئے۔'' پھر پوچھا۔'' راہ میں
جوں جوں تمھارا جسم منزلیں طے کر رہا تھا تمھارا قلب
بھی حق کی منازل طے کرنے میں مصروف تھا۔'' جواب
ملا'' ایسا تو نہیں ہوا۔'' فرمایا'' پھر تم نے سفر حج کی
منزلیں طے ہی نہیں کیں۔'' پھر پوچھا'' احرام کے لیے
اپنے جسم سے کپڑے اتارے تھے اس وقت اپنے نفس
سے بھی صفات بشریہ کا لباس اتارا تھا؟'' کہا
''نہیں'' فرمایا'' پھر تم نے احرام ہی نہیں باندھا۔'' پھر
پوچھا'' جب عرفات کے وقوف اور مزدلفہ کے قیام میں
اپنی مراد کو پہنچ چکے تو خواہشات نفسانی کو ترک کرنے کا
بھی عہد کیا۔'' کہا'' نہیں'' فرمایا'' پھر تم مزدلفہ اور
عرفات میں حاضر ہی نہیں ہوئے۔'' پھر پوچھا'' قربانی
کے وقت اپنے نفس کی گردن پر بھی چھری چلائی۔''
جواب ملا'' نہیں'' فرمایا'' تمھارا حج کرنا نہ کرنا برابر
ہے۔ جاؤ اور صحیح طریقے پر حج کرو۔'' (کشف

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

یہ نمکین اور میٹھے رشتے!

خاندانی تعلقات کی استواری

انسانوں کے اس وسیع وعریض سمندر میں رشتوں ناطوں کا میٹھا اور کھاری پانی نمایاں نظر آتا ہے۔
رشتوں میں دراڑ ڈالنے والے رویوں سے بچنے کے لئے قرآن سے رہنمائی لینا ضروری ہے۔

اللہ رب العالمین نے خاتم النبیین ﷺ پہ کتاب اُتاری جو ھُدً ی للعٰلمین ہے اور اس میں کائنات کے بارے میں بے شمار آیات اُتاریں اور عقل والوں کے لیے اس میں غور وفکر کی دعوت ہے۔ ارض وسما کی ہر شے اللہ تعالیٰ سے رابطے کا ذریعہ ہے۔ قرآن پاک میں جابجا آیات الٰہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ عقل وخرد رکھنے والے آثار کائنات پر غور کر کے توحید کا اقرار کریں۔ اس کو وحدہٗ لاشریک تسلیم کریں اور اس کے حقیقی بندے بن جائیں۔

سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ ایک لذیذ شیریں اور دوسرا تلخ وشور، اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے، ایک رکاوٹ ہے جو انہیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔'' (آیت ۵۳)

اس آیت کی تشریح میں تفہیم القرآن جلد سوم حاشیہ ۲۸ میں مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: یہ کیفیت ہر اس جگہ رونما ہوتی ہے جہاں کوئی بڑا دریا سمندر میں آ کر گرتا ہے۔ اس کے علاوہ خود سمندر میں بھی مختلف مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں جن کا پانی سمندر کے نہایت تلخ پانی کے درمیان بھی اپنی مٹھاس قائم رکھتا ہے۔

ترکی امیر البحر سیدی علی رئیس (کاتب والی) اپنی کتاب مرأۃ الممالک میں جو سولہویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے، خلیج فارس کے اندر ایسے مقام کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہاں آب شور کے نیچے آب شیریں کے چشمے ہیں جن سے میں خود اپنے بیڑے کے لئے پینے کا پانی حاصل کرتا رہا ہوں۔ موجودہ زمانے میں جب امریکن کمپنی نے سعودی عرب میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا تو ابتداً وہ خلیج فارس کے انہی چشموں سے پانی حاصل کرتی تھی۔ بعد میں ظہران کے پاس کنویں کھود لیے گئے اور ان سے پانی لیا جانے لگا۔ بحرین کے قریب بھی سمندر کی تہہ میں آبِ شیریں کے چشمے ہیں جن سے لوگ کچھ وقت پہلے تک پینے کا پانی حاصل کرتے رہے ہیں۔

یہ تو ہے آیت کا ظاہری مضمون، جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے سے اس کے الٰہ واحد اور ربِ واحد ہونے پر استدلال کر رہا ہے۔ مگر اس کے بین السطور سے بھی ایک لطیف اشارہ ایک دوسرے مضمون

کی طرف نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے کا سمندر خواہ کتنا ہی تلخ وشور ہو جائے اللہ تعالیٰ جب چاہے اس کی تہہ سے ایک جماعت صالحہ کا چشمہ شیریں نکال سکتا ہے اور سمندر کے آبِ تلخ کی موجیں خواہ کتنا ہی زور مار لیں وہ اس میٹھے چشمے کو ہڑپ کر جانے میں کامیاب نہیں ہوسکتیں (تفہیم القرآن، ج سوم، ص ۴۵۸)

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے۔ جوڑا بنانے میں بہت سی مصلحتیں اور حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ ایک حقیقت تو نر و مادہ کے جوڑے سے پیدائش کا تسلسل بنایا۔ ذی روح مخلوق ہو نباتات ان کے جوڑے مسلمہ حقیقت ہیں۔ اس کے علاوہ پہچان کے لئے، غور وفکر کے لئے اور بہت سی پوشیدہ مصلحتوں کے تحت کائنات میں ہر طرف تزویج کا عمل جاری وساری ہے کہ یکتا وتنہا صرف رب العالمین کی ذات ہے۔

دن رات، دھوپ چھاؤں، گرمی سردی، غم خوشی، اندھیرا اجالا، صحت بیماری غرض ہر معاملے میں دو طرح کا احساس نمایاں ہے۔ اسی طرح دریاؤں کا پانی میٹھا بنایا۔ سمندروں کا پانی کھارا بنایا اور اپنی قدرت کا کرشمہ دکھایا کہ کھاری پانی کے طویل وعریض سمندر میں میٹھے پانی کے چشمے جاری کر دیئے۔ بظاہر پانی ایک جیسا نظر آتا ہے، مگر دونوں کے درمیان ایک نظر نہ آنے والا پردہ حائل ہے۔

ایک اور نظام جو سمندروں کے حوالے سے ازل سے چل رہا ہے وہ یہ ہے کہ اسی کھاری اور بھاری پانی کو ہوائیں اُڑا کر لے جاتی ہیں جو کہ میٹھا اور ہلکا ہوتا ہے۔ یہ پانی بارش کی شکل میں جہاں اللہ اپنی مرضی سے چاہتا ہے برساتا ہے اور یہی پانی ندی نالوں، چشموں، دریاؤں سے ہوتا ہوا دوبارہ سمندر میں ضم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ کارندے اپنے کام میں مستعد ہیں اور جب تک مالک کا حکم ہوگا اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوتے رہیں گے اور اس میٹھے اور کھاری پانی کا دائرہ چلتا رہے گا۔

اب تو کھاری پانی کو عام استعمال کے لئے حتیٰ کہ گھروں اور کھیتوں میں روزمرہ کے استعمال کے لئے صاف کرنے کے انتظام ہونے لگے ہیں۔ تلخ او رکھاری پانی کو میٹھا بنانے کے لیے پلانٹ لگائے جاتے ہیں۔ انسانی دماغ وقت، محنت، مشقت اور بہت کچھ قربان کر کے تلخ کو شیریں بنانے میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔ جب کائنات انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہے تو مسخر کرنے کے لئے عقل اور وسائل بھی مہیا کیے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان کی مذکور پہلی آیت کے بعد فرمایا، اللہ تعالیٰ کی ہر آیت کا تعلق او رنسبت ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے، ہر آیت دوسری آیت کا مفہوم واضح کرتی ہے: ''اور وہ ہے جس نے پانی سے

ایک بشر پیدا کیا، پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے۔ تیرا رب بڑی ہی قدرت والا ہے۔'' (الفرقان ۲۵:۵۴)

یہ اسی کی قدرت ہے کہ دونوں کی یکجائی کے نتیجے میں نسب کا سلسلہ بنتا ہے اور یہ دائرہ چلتا رہتا ہے۔ اس کی تشریح میں مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''یعنی بجائے خود یہی کرشمہ کیا کم تھا کہ وہ ایک حقیر پانی کی بوند سے انسان میں حیرت انگیز مخلوق بنا کھڑی کرتا ہے مگر اس پر مزید کرشمہ یہ ہے کہ اس نے انسان کا بھی ایک نہیں بلکہ دو نمونے (عورت اور مرد) بنائے جو انسانیت میں یکساں مگر جسمانی ونفسانی خصوصیات میں نہایت مختلف ہیں، اور اس اختلاف کی وجہ سے باہم مخالف ومتضاد نہیں بلکہ ایک دوسرے کا پورا جوڑ ہیں اور پھر ان جوڑوں کو ملا کر وہ عجیب توازن کے ساتھ (جس میں کسی دوسرے کی تدبیر کا ادنیٰ دخل بھی نہیں ہے) دنیا میں مرد بھی پیدا کر رہا ہے اور عورتیں بھی، جن سے سلسلہ تعلقات بیٹوں اور پوتوں کا چلتا ہے۔ جو دوسرے گھروں سے بہوئیں لاتے ہیں اور ایک دوسرا سلسلہ تعلقات بیٹیوں اور نواسیوں کا چلتا ہے جو دوسرے گھر میں بہوئیں بن کر جاتی ہیں۔ اس طرح خاندان جڑ کر پورے ملک ایک نسل اور ایک تمدن سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

یہاں بھی ایک لطیف اشارہ اس مضمون کی طرف ہے کہ سارے کارخانۂ حیات میں جو حکمت کام کر رہی ہے اس کا اندازِ کار ہی کچھ ایسا ہے کہ یہاں اختلاف اور پھر مختلفین کے جوڑ سے ہی سارے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ لہٰذا (اے انسانو!) جس اختلاف سے تم دوچار ہو، اس سے گھبراؤ نہیں یہ بھی ایک نتیجہ خیز چیز ہے۔ (تفہیم القرآن، حصہ سوم، ص ۴۵۹)

آدمؑ وحواؑ بحیثیت انسان ایک مخلوق ہے مگر دونوں میں اختلاف بھی ہے۔ دونوں میں جسمانی ونفسانی اختلاف ایک دوسرے کا تتمہ ہے۔

اسی طرح انسانی دل کو مختلف قسم کے احساسات سے آشنا کر دیا۔ قلب جس میں انقلاب، تبدیلی، مسلسل حرکت کی خاصیت ہے۔ منفی ومثبت سوچوں سے جذبات واحساسات سے دوچار رہتا ہے۔ قلب میں انقلاب پوشیدہ ہے۔ اس کی ماہیت ہی تبدیل ہوتے رہنا ہے اور اس کی حرکت ہی انسان کی زندگی کی علامت ہے۔ ایک انسان کے اسی ایک دل میں نہ جانے کب میٹھے جذبات کھاری پن میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ ہم اپنے دل کی کیفیات کو آن کی آن تبدیل ہوتا محسوس کرتے ہیں۔ کچھ چہرے، کچھ مقام ہمارے دل کو بھاتے ہیں۔ اسی لمحے اگر ناپسند چہرے اور مقام آجائیں تو دل میں انقباض پیدا ہوتا ہے۔ کچھ کام ہم دل کی پوری آمادگی سے کرتے ہیں اور کچھ بادل نخواستہ۔ کچھ

معاملات پیش آنے پر ہمارا دل رنجیدہ ہوتا ہے اور ہم ہی ہوتے ہیں جو اپنے اسی رنجیدہ دل میں کچھ معاملات میں راحت وخوشی محسوس کرتے ہیں۔

چونکہ کائنات میں ہر چیز جوڑا یعنی اصولِ تزویج پہ بنائی گئی ہے اسی لیے سلطنت کائنات میں قانونِ طبعی کے ساتھ ساتھ قانونِ اخلاق بھی کارفرما ہے۔ چونکہ فطرت خود عدل پر قائم کی گئی ہے اس لئے تقاضا کرتی ہے کہ ہر جگہ عدل ہو، اور توازن دراصل عدل ہی کا دوسرا نام ہے۔اور توازن کسی بھی عمل اور چیز کو حُسن بخشتا ہے۔تزویج میں تضاد واختلاف ہونا، حقیقت میں تکمیل ہونا ہے۔ کائنات ہو یا انسانی اخلاق، توازن حاصل کرنے اور چیزوں کی حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ تضاد اور اختلاف ہی ہے۔ ہر چیز اپنی ضد کے ذریعے ہی شعوری پہچان دیتی ہے۔

انسانی مزاج اور خصلت میں منفی اور مثبت دونوں رخ پائے جاتے ہیں۔وہ ظالم بھی ہے مظلوم بھی، حاکم بھی ہے محکوم بھی ہے۔ وہ احسان کیش بھی ہے احسان فراموش بھی۔ وہ محبت کرتا ہے تو نفرت بھی، کبھی سخی ہے کبھی بخیل۔ منفی ومثبت احساسات وجذبات کی ایک طویل فہرست ہے جس سے انسان وقت وحالات کے ساتھ نبرد آزما رہتا ہے۔کبھی وہ سسرال ہوتا ہے اور کہیں نسبی رشتہ نبھانا ہوتا ہے۔ گویا ہر فرد نسب اور مہر سے جڑا ہوا ہے جیسے دایاں اور بایاں بازو جسم سے جڑے ہیں یا پھر جیسے تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔

انسانی رشتوں کو نبھانے کے لئے کتنے ہی نشیب وفراز منفی ومثبت اندازِ فکر سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک عجیب وغریب معاملہ ہے کہ ایک انسان سے کچھ رشتے اور تعلق ایسا ہوتا ہے کہ محبت وعقیدت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دل میں موجزن ہوتا ہے، مگر اسی انسان سے کچھ لوگوں کی وابستگی میں وہ فریفتگی اور تعلق نہیں ہوتا، چاہیں بھی تو نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ایک انسان کچھ لوگوں کی محبت سمیٹتا ہے تو وہی انسان کچھ لوگوں کے لئے قابلِ نفرت ہوتا ہے۔ متضاد، طبعی حالتیں اور فطری جذبات کی کمی بیشی اس زمین کے باسیوں کو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں۔اور کچھ آفاقی واخلاقی قوانین کی بنا پر انسانوں کے مزاج ایک دوسرے سے ہم آہنگ بھی ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اختلافات سے مبرا نہیں ہوسکتے۔ حتیٰ کہ جڑواں بچے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوجاتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ نے قانونِ تزویج پہ دو الگ سلسلے چلائے۔ جن کو نسب اور سسرال کا نام دیا۔ ان دونوں کے درمیان تلخ وشیریں پانی اور مزاجوں اور تزویج کی مثال دی جاسکتی ہے۔انسانوں کے اس وسیع وعریض سمندر میں رشتوں ناطوں کا میٹھا پن اور کھاری پانی نمایاں نظر آتا ہے۔ بظاہر سب انسان ایک جیسے ہیں مگر جیسے پانی کے درمیان ایک اَن دیکھا پردہ حائل رہتا ہے جیسے ایک انسان مختلف منفی ومثبت مزاج کا

حامل ہے جیسے دل کی کیفیات میں تبدیلی آنے میں دیر نہیں لگتی۔

نسب اور صھر کے رشتوں میں بھی ایک حجاب حائل رہتا ہے۔ یہ کسی خاص قوم یا معاشرے کا معاملہ نہیں ہے۔ اس دنیا کی ہرقوم میں ''نسب'' اور'' صھر''میں تعلقات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ نسب کے رشتے جب سسرالی رشتوں میں تبدیل ہوتے ہیں تو احساسات، جذبات ،گمان، توقعات میں فرق آجاتا ہے۔ منتوں مرادوں سے حاصل کردہ رشتوں میں بھی برائیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اور گلے شکوؤں کے انبار لگنے لگتے ہیں۔ مرد ہو یا عورت، اپنے سسرال اور میکے والوں کے درمیان کچھ نہ کچھ امتیاز ضرور برت رہا ہوتا ہے۔ معاملات، جذبات واحساسات کا فطری میلان نسب کے رشتوں کے ساتھ کچھ اور ہے اور صھر کے ساتھ کچھ اور۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قانونِ وراثت میں نسب اور سسرال کے امتیاز کو اپنی فطری میلانات کے ساتھ بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حقوق العباد کی اہمیت ان کی ترتیب کے ساتھ متعین کی ہے، وراثت کی تقسیم ہو یا رشتوں کی تعظیم۔ اطاعت وفرماں برداری ہو یا خدمت ،رشتوں کے فطری میلانات کا خیال رکھا گیا ہے۔ بیٹے کے لئے ماں اور بیوی کے لیے شوہر افضل ہے اور اس میں توازن رکھنا ہی امتحان ہے۔ جب بہن بھائی اپنے بچوں کے رشتے آپس میں کرتے ہیں تو اولاد کا میٹھا رشتہ فطرتاً زیادہ قریب ہوتا ہے۔ یہاں بھی عدل وتوازن اور فطری جذبے نفس اورانا کے ہتھے نہ چڑھیں تو زندگی کے اس سمندر سے سکون اور خوشی کے جواہرات حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

پوری دنیا کی معاشرت گواہ ہے کہ ایک عورت اپنی بیٹی کے لئے جو کچھ تمنائیں وخواہشات رکھتی ہے وہ اپنی بہو کے لئے نہیں رکھتی۔ وہ داماد کو بیٹی کا تابع دار اور بہو کو اپنے بیٹے کی تابع دار دیکھنا چاہتی ہے۔ ایک بہو اپنی ماں کی سخت مزاجی کو برداشت کرتی آئی ہوتی ہے مگر اپنی ساس کی جائز بات بھی برداشت نہیں کرتی۔ اسی طرح مرد کے رویے اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے اور ''صھر'' کے رشتوں سے فرق ہوتے ہیں۔ نسب کے رشتے بھی جب سسرال کے رشتے میں تبدیل ہوتے ہیں اور اکثر دل کی مٹھاس میں کمی آجاتی ہے۔ پھر اسی صھر کی نسبت سے نسب کے میٹھے رشتے بنتے ہیں۔ ان میں تعلق کی نوعیت کچھ اور ہی بن جاتی ہے۔ گویا قانونی رشتوں کے نمکین پانی سے پھر میٹھا پانی وجود میں آنے لگتا ہے۔

نسب اور صھر کے رشتوں کے مابین غوروفکر کی بات یہ ہے کہ قانونی رشتوں کے لئے زاویہ نگاہ کہاں او رکیوں بدل جاتا ہے؟ لفظوں کے انتخاب میں بداحتیاطی کی وجہ کیا ہے؟ دلوں میں احساسِ نازک کی

ڈور کیوں ٹوٹ جاتی ہے؟

انسانی مزاجوں میں اچانک تبدیلی کیسے آجاتی ہے؟ قانونی رشتے کے بارے میں اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو ''نسب'' اور ''صھر'' کا معاملہ سمندر اور بارش اور پھر دریا کے پانی کا سمندر میں آملنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر کے کھاری پانی اور میٹھے پانی کی مثال دے کر متصلاً آدمؑ کی پیدائش اور پھر دو سلسلوں کی بات کر کے ایک گہری نشان دہی کی ہے کہ جس طرح کھاری پانی سے ہی پھر میٹھے پانی کا حصول ہوگا (بارش کی صورت میں) اسی طرح ''صھر'' سے ہی ''نسب'' کا میٹھا رشتہ وجود میں آئے گا۔ گویا کہ ہر انسان دو قسم کے جذبات رکھتا ہے، دو قسم کے رشتے رکھتا ہے۔ قانونی رشتے کے لیے زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے کہ قانون کا احترام یا تو سزا کے خوف سے ہوتا ہے یا پھر انعام کے لالچ میں۔

اگر چہ قانون لوگوں کے مفاد کے لئے ہوتا ہے۔ درست سمت چلنے کے لئے ہوتا ہے مگر طبیعت پہ شاق گزرتا ہے۔ وہ اگر اللہ تعالیٰ کا قانون ہو تو دو جہاں کے لئے کامیابی کی ضمانت ہے۔ اور دونوں جہان کی زندگی آسان بنانے کے لئے قانون کی پابندی میں جب دل کی رغبت اور بھلائی کا یقین شامل ہوگا تو قانون پر عمل بھی آسان ہو جائے گا اور احساسِ نازک کی ڈور خوفِ خدا کی وجہ سے جڑی رہے گی۔ اور انعامات الٰہی کے حصول کے لالچ سے معاملات میں سُدھار کا احساس غالب رہے گا۔ بے شک یہ سب کرنے کے لئے نفس پہ جبر کرنا ہوگا۔

جو قانون کی افادیت کو جان لیتا ہے، وہ سزا سے بچنے اور انعام پانے کی تگ و دو میں لگ جاتا ہے۔ وہ قانون کا احترام کرتا ہے اسی میں اس کا فائدہ ہے۔ قانون سب کے لئے ہوتا ہے۔ قانونی رشتوں سے بھی واسطہ ہر مرد اور عورت کو پڑتا ہے، دونوں کے لئے ان کا احترام لازم ہے۔ انسانی وجود کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے دو رُخ ہیں، دو پہلو ہیں۔ دایاں پہلو جو اعضا رکھتا ہے وہی بایاں بھی رکھتا ہے، ایک جیسے ہونے کے باوجود دونوں الگ ہیں۔ دونوں اپنے مقام پہ رہ کر ہی کارآمد اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر کے ہی دنیا میں کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح رشتوں کی حقیقت کو پہچان کر ان کے تضادات کا ادراک کر کے ان کے طبعی اختلافات سے گھبرانے کے بجائے ان کو نتیجہ خیز بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ایک ہی درخت کے پھل مختلف ذائقے کے ہیں۔ کوئی کھٹا ہے کوئی میٹھا۔ ایک ہی آدم کی اولاد مختلف مزاج رکھتی ہے۔ کوئی نافرمان ہے، کوئی فرماں بردار، کوئی حلاوت والا ہے تو کوئی ملاحت والا مزاج رکھتا ہے۔ کوئی میٹھے مزاج کا ہے کوئی کڑوے یا کھٹے مزاج کا۔ جیسے پھلوں کا کھٹا میٹھا ذائقہ اور کڑواہٹ کی وجہ

سے مٹھاس کی پہچان ہوتی ہے۔ یہی امتیازات ہی دنیامیں دل چسپی کا اور رونق کا باعث ہیں تو یہی جذبات ومعاملات اور اخلاقی رویے امتحان بھی ہیں، ایک دوسرے کے لئے آزمائش ہیں اور نیکیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے مواقع بھی ہیں۔ ان سب حقیقتوں کو جان کر قانونی رشتوں کے نمکین اور کھاری پانی میں میٹھے چشمے تلاش کرنے کے لئے محنت مشقت کرنا ہوگی۔ جس طرح منفی جذبات، منفی اعمال، غصہ، غیبت، کینہ، حسد وغیرہ کو نفس پہ جبر کر کے درست کیا جاسکتا ہے۔ اور رشتوں کے آبِ تلخ کی موجیں خواہ کتنا ہی زور لگالیں وہ اس میٹھے چشمے کو ہڑپ کر جانے میں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ اس میٹھے چشمے تک پہنچنے سے پہلے انسان کے لئے رشتوں کی ترجیحات کو مدنظر رکھتے ہوئے توقعات کی ترجیحات بھی متعین کرنا لازم ہیں۔ بے محل توقعات سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ عقل مند وہ ہے جو توقعات وابستہ کرنے سے پہلے تعلقات کی نوعیت اور ترتیب وترجیحات کو پرکھ لے۔

مرد اور عورت دونوں کی یہ خواہش اور مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے والدین اور رشتہ داروں کو ویسی ہی مثبت نگاہ سے دیکھے جیسے کہ وہ خود دیکھتا یا دیکھتی ہے۔ دونوں خود اپنے رشتہ داروں کے بارے میں منفی خیالات رکھتے ہوں تو بھی وہ اپنے ساتھی سے توقع رکھتے اور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ہمارے خاندان کے بارے میں ایک لفظ منہ سے نہ نکالے۔ ایک دوسرے سے بے محل اور انتہا درجے کی توقعات رکھنے کے کوئی اچھے نتائج سامنے نہیں آتے۔

ساس اپنی بہو سے توقع رکھتی اور مطالبہ کرتی ہے کہ وہ سگی بیٹی سے بھی بڑھ کر فرمانبردار اور محبت کرنے والی ہو اور بہو اپنی ساس سے اپنی ماں جیسی بلکہ کچھ زیادہ ہی عفوودرگزر چاہتی ہے۔ دونوں اس پیمانے پر پورا نہیں اترتیں۔

دنیا کی کوئی عورت اپنی کوکھ سے جنم دینے والے بچے سے زیادہ کسی کو نہیں چاہ سکتی، اور جس نے جنم دیا ہے اس کی جگہ اور مقام کوئی نہیں لے سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے رشتوں کی جو ترتیب اور ترجیحات متعین کی ہیں ان کی حقیقت کو ساتھ لے کر سمجھ کر اور پورے شعور اور ادراک کے ساتھ، ان کے اصلی مقام پہ رکھتے ہوئے زندگی کی راہ پہ چلنا ہوگا۔

اور یہی اصول ہر رشتے کو نبھانے کے لئے کارفرما رکھنا ہوگا۔ رشتوں کے اس گلستان میں جس رشتۂ گل کا جو مقام ہے رنگ اور خوشبو ہے اس کو قبول کرنا ہوگا۔ گلاب کے ساتھ اگر کانٹے ہیں تو یہ قدرت کا اٹل فیصلہ اور حکمت عظیم ہے۔

ہر انسان نسب اور صھر کے رشتے سے منسلک ہے کیونکہ یہ ایک سرکل ہے۔ ہر جوڑا قانون کے تحت یک جا ہوتا ہے۔ پھر ان سے (صھر کے رشتے سے) نسب

کا سلسلہ چلتا ہے۔ جیسے لطیف ہوا مل کر سمندر کے کھاری اور بھاری پن کو زندگی بخش بارش میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اسی طرح ہر مرد اور عورت اپنی پر خلوص محبت کی حرارت اور حُسن عمل کی ہوا سے معاشرے میں امن وسکون کا ابر باراں اور رحمت کا باعث بن سکتا ہے۔

سورۃ فرقان کی مندرجہ بالا آیات کے بعد توحید ورسالت اور آثارِ کائنات پہ غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ اس کے بعد معاشرے میں آئیڈیل اور مثالی لوگوں کے کردار کو واضح کیا گیا ہے اور رشتے کی تلاش کے لئے کردار جانچنے کا ایک پیمانہ بھی دے دیا گیا ہے اور باہمی تضاد وانتشار، اختلافات ونزاعات میں ایک ربانی کردار کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ تنازعات خاندانی ہوں، نسب کے رشتوں میں ہوں یا صھر کے ادارے کے کارکنان کے درمیان ہوں، کسی قوم برادری کے درمیان ہوں غرض زندگی کے ہر شعبے میں، یہ ایک نسخۂ کارگر ہے جو اخلاقی بیماریوں کی مکمل شفا کا باعث ہے۔ تلخ وشور جذبات کو ہر ممکن میٹھا بنانے کا فارمولا۔ اس نسخے اور فارمولے کو ہر خاص وعام کے لئے یکساں مفید بنایا گیا ہے۔ عمر، جنس، رشتے، مقام، ماحول اور حالات وواقعات کوئی قید نہیں ہے، جو زندگی میں رشتوں کی مٹھاس کشید کرنا چاہتا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے مگر شرط رب سے اجر کی توقع ہے۔ رب کی رضا جب نصب العین ہو تو انسانوں سے توقعات کا پودا پنپنے نہیں پاتا۔ اور ایسے ہی کردار مومنین کو اس رحمٰن ورحیم ذات نے اپنے خالص اور اصلی بندے ہونے کا اعزاز بخشا ہے۔ جیسے کسی بڑی کمپنی میں کسی ملازمت کی پیش کش ہو جائے۔ کمپنی خود اس کو اپنے ادارے میں جگہ دے، اس کی کارکردگی کے پیش نظر اس کو اعزازت سے نوازے اور فخر کرے اور دنیا میں تشہیر کرے کہ یہ شخص ہمارے ادارے کا ممبر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کائنات کے معزز کارندے کا تعارف کراتے ہیں اور رشتے کی تلاش کے لئے ایک ایسا خاکہ تیار کر کے دیا گیا ہے جو ''معزز'' ہونے کی دلیل ہے۔

رحمٰن کے اصلی بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں۔ ان کی شخصیت پہلی نظر میں ہی اپنے کردار کی وضاحت کر دیتی ہے۔ چال ڈھال سے اللہ کے بندے کا مقام ومرتبہ اور احساسِ ذمہ داری نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے ذہن اس کی سیرت وکردار کی اولین ترجمان بھی اس کی چال ڈھال ہی ہوتی ہے۔ کسی سابقہ تعارف کے بغیر ہی رحمٰن کے بندے اپنی پہچان کرا دیتے ہیں۔ اسی طرح خاندان، قوم اپنی خاص شناخت رکھتے ہیں۔ نئے رشتوں میں بندھنے سے پہلے، اگر ایسا کردار تلاش کیا جائے اور ایسی ہی شخصیت اپنی بنائی جائے تو بنیادیں مضبوط ہوں گی۔ رحمٰن کے اصلی بندوں والے گھرانے خاص ترکیب سے تشکیل

پاتے ہیں۔ رحمٰن کی بندگی ان کی ذہنیت اور سیرت کو دوسروں سے ممتاز بنا دیتی ہیں۔

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

جب متعین ہوگیا کہ رحمٰن کے بندوں کی ظاہری شخصیت، شرافت، حلم اور بردباری و ہمدردی ہے تو اگلی صفت خود بخود ظاہر ہونے لگتی ہے۔

☆ جب جاہل ان کے منہ کو آئیں تو کہہ دیتے ہیں، تم کو سلام۔ (۶۳)

یعنی رشتوں ناتوں اور دیگر معاملات میں کوئی غیر شریفانہ طرزِ عمل اختیار کرے تو وہ نزاع کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں نہ کہ بحث بحثی میں پڑ کر طول دیتے۔ اور اپنی انا کا بت پوجنے میں لگ جاتے ہیں۔ بیوقوف سے تکرار کرنا اور بھی زیادہ بے وقوفی ہے۔ قیامت کے دن جب لوگ گزرے ہوئے حالات ایک دوسرے سے پوچھیں گے تو جنتی لوگ کہیں ''ہم دنیا میں اپنے گھر والوں کے درمیان بے خوف ہو کر نہیں بلکہ احساسِ جواب دہی کے ساتھ ذمہ داریاں ادا کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے (تقویٰ کی) زندگی گزارتے تھے، اسی لئے آج اللہ کریم نے ہم پہ فضل فرمایا ہے (الطّور، ۲۵۔۲۷)

☆ وہ جب کوئی غیر شریفانہ طرزِ عمل سے دوچار ہوتے ہیں یا بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بھائی! ہمارے اعمال ہمارے لیے تمہارے اعمال تمہارے لیے، سلام ہے تم پر (ہماری طرف سے) ہم جاہلوں کے منہ نہیں لگتے۔ (القصص ۲۶:۵۵)

انسانی معاشرے میں جب فطرت کے خلاف طرز زندگی پنپنے لگتا ہے تو سکون اور عافیت رخصت ہو جاتا ہے۔ مسلم گھرانوں میں شب و روز کے اوقات جس طرح غیر فطری ہوگئے ہیں تو عبادتوں اور ریاضتوں کا رخ بھی بدل گیا ہے۔ رات کے اوقات سکون اور آرام کے لئے ہوتے ہیں، یا اپنے رب سے مناجات کے لئے کہ محبوب سے ملاقات کا وقت تنہائی کا ہی ہوتا ہے۔

دن میں شریفانہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے لوگوں کے ساتھ معاملات طے کرتے ہیں تو رات کو اپنے رب کے ساتھ خشوع و خضوع، الحاح وزاری کا معاملہ رکھتے ہیں:

وہی شخص رب سے ڈرتے ہوئے رات کے اوقات بسر کرے گا جو دن کو اپنے معاملات رحمٰن کا بندہ ہونے کی حیثیت سے طے کرے گا۔ راتیں لہو ولعب کے لئے نہیں ہیں اور دنیا کی رنگینیوں میں مگن ان کی مسرتوں میں مبتلا ہونے کے لئے نہیں ہیں۔ رحمٰن کے خالص بندے تو یہ ہیں۔

☆ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں کہ ہمارے

رب، جہنم کے عذاب سے ہم کو بچالے اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ تو بہت ہی برا مستقر اور مقام ہے (الفرقان ۲۵:۶۶)

جو جہنم کے عذاب سے بچنے کی فکر کرتا ہے وہ اپنے معاملات پہ بھی کڑی نظر رکھتا ہے۔ ہر گھر، خاندان میں باہمی چپقلش کی ایک وجہ معاشی رویے بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان مسائل کا حل بیان کیا ہے کہ تلخی، دلوں سے دور ہو۔ اور برکت کی مٹھاس معاشی معاملات میں نظر آئے جس سے معاشرت میں حُسن پیدا ہو۔

☆ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بُخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پہ قائم رہتا ہے۔

☆ اور کسی بھی حال میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی معبود نہیں بناتے۔ نہ ہی اللہ کی حرام کی ہوئی جان کو ناحق قتل کرتے ہیں اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ (۶۸)

معبودانِ باطل، اقتدار، شہرت، نفس پرستی، مال و دولت وغیرہ سے اپنا دامن بچا کر رکھتے ہیں اور قتلِ ناحق کی وجہ ان سب معبودانِ باطل سے وابستگی کی بنا پر ہوتا ہے۔ اور پھر ایک خاص گناہ کی طرف اشارہ ہے جس سے معاشرے میں ابتری پھیلتی ہے۔ گھروں اور دلوں میں پاکیزگی کے بجائے گندگی پھیلتی ہے۔ جب عزت آبرو سے بے نیازی کا چلن عام ہو جائے تو گونا گوں عذاب نازل ہوتے رہتے ہیں۔ اس بے حیائی کے عذاب سے ڈرایا جارہا ہے ''جو کوئی یہ کام کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اس کو بار بار عذاب دیا جائے گا اور وہ ہمیشہ اسی ذلت میں پڑا رہے گا۔ (۶۹)

اس بے حیائی کو عام کرنے والے، فواحش کو آسان کرنے والے اور اس کا ارتکاب کرنے والے توبہ کر کے عملِ صالح کی طرف آجائیں تو باہمی تعلقات کی کڑاوہٹ دور ہو جائے گی۔ بدکاری کے مرتکب لوگ صرف اپنے لیے نہیں پورے خاندان اور قبیلہ قوم کے لئے باعث ننگ وعار ہوتے ہیں۔ ''مگر جو اپنے گناہوں سے توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عملِ صالح کرنے لگا ہو تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ بھلائیوں میں بدل دے گا، اس لیے کہ وہ بڑا غفور رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عملی اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ کی طرف ایسے پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے۔'' (۷۱)

معاشرے میں اور باہم گھرانوں میں تعلقات کی درستگی میں اس طرزِ عمل کو بہت عمل دخل ہے۔ گناہ کے بعد ہٹ، مزید گناہ کا باعث ہے۔ نیک طرزِ عمل اور توبہ پہ استقامت ہوگی تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے تائب بندوں کو نیکی کا راستہ آسان کر کے دکھائے اور برائیوں کو نیکیوں سے بدل لینے کے مواقع فراہم

کرے۔

جھوٹ اور مومن دو متضاد چیزیں ہیں۔ رحمٰن کے اصلی بندے اپنے گھروں میں، معاشرے میں نہ جھوٹ بولتے ہیں نہ جھوٹ کو فروغ دیتے ہیں۔ جھوٹ بولنے والے لوگ تلخیوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جھوٹ پر قائم کردہ رشتے ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ قانونی رشتوں کو جھوٹ کی بنیاد پر قائم کیسے رکھا جاسکتا ہے؟ ''رحمٰن کے اصلی بندے وہ ہیں جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے۔'' یعنی مومن حق کی معرفت رکھتا ہے اور جھوٹ کی تائید نہیں کرتا۔ گواہ نہیں بنتا۔ رشتے ہوں یا معاملات حق کا ساتھ دیتا ہے اور کسی لغو بات پہ ان کا گزر ہوتا ہے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔'' (۷۲)

یعنی جان بوجھ کر ایسی چیزیں دیکھنے، سننے یا ان میں حصہ لینے کے لئے نہیں جاتے بلکہ اتفاقاً گزرتے ہوئے نظر پڑ بھی جائے تو دوسری نگاہ ڈالے بغیر شرافت سے گزر جاتے ہیں۔ غلاظت وگندگی کے ڈھیر سے دامن بچا کر نگاہ ڈالے بغیر تیزی سے گزر جاتے۔ کجا کہ کوئی اس گندگی میں جان بوجھ کر، رقم خرچ کر کے، اپنا قیمتی وقت برباد کر کے سانس لینے کی حماقت کر رہا ہو۔ خوش ذوق اور مہذب انسان غلاظت کو ایک منٹ کے لئے بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ معاشرے میں ہر طرف پھیلی فواحش کی غلاظت نے گھروں کے باہم تعلقات ومعاملات کو بہت متاثر کیا ہے۔ رحمٰن کے اصلی اور خالص بندے رشتوں کے تقدس کو قائم رکھتے اور ان میں تلخی گھولنے سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ نسب اور قانونی رشتوں کے درمیان فاصلے مٹانے کا نسخہ یہ ہے کہ ''رحمٰن کے پیارے بندوں کو جب رب کی آیات سنا کر غلطی پہ متنبہ کیا جاتا ہے تو اس پہ اندھے بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔''

باہم رشتوں میں نشیب وفراز آتے ہیں۔ ان پہ اصرار نہیں کرتے۔ تنازعات کے کانٹے ختم کر کے عافیت کی راہ اسی ایک نکتہ میں مستور ہے (وَ لَمْ یُصِرُّوا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ عمران:۳:۱۳۵)

رحمٰن کے پیار کو حاصل کرنے والے تو اپنی گھریلو اور خاندانی زندگی میں بہار لانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ''نسب'' کا رشتہ یا ''صھر'' کا وہ اپنی اولادوں اور زندگی کے ساتھی کے لیے یکساں خیر کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اپنی اولادوں کے علاوہ اپنے بیٹے اور بیٹی سے چلنے والے سلسلے کے لئے دعائیں مانگا کرتے ہیں ''اے ہمارے رب! ہمیں اپنی زندگی کے ساتھی اور اولادوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنادے۔'' (۷۴)

اپنے نفس کی شرانگیزیوں اور تلخیوں پہ قابو پانے کے لئے وہ صبر واستقامت سے کوشش میں لگے رہیں

گے تا کہ دنیا میں ان کی معاشرت امن وسکون کا گہوارہ بنے اور اپنے گھروں میں چین سے رہیں جہاں ''نسب'' اور ''صھر'' کے رشتے اپنی اپنی مٹھاس کے ساتھ تلخیوں پہ قابو پا لیتے ہیں۔

انسانوں کے سمندر میں میٹھے چشمے جیسے متصف لوگوں اور گھرانوں کے لئے خوشخبری ہے ''وہ اپنے صبر کا پھل منزل بلند کی شکل میں پائیں گے۔'' حُسن معاشرت کی ایک تصویر دنیا میں ان کے سامنے تھی کہ وہ اپنے رشتوں کو نبھاتے ہوئے گھروں میں بلند مرتبہ رہے۔ تو آخرت میں ان گھرانوں کو منزل بلند کی شکل میں رہائش عطا کی جائے گی۔

''آداب وتسلیمات سے ان کا استقبال ہوگا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ کیا ہی اچھا مستقر ہے اور کیا ہی بہترین ہے وہ مقام۔'' (۷۶)

سبحان اللہ! یہ باہمی رشتوں میں ایک دوسرے کی خیر خواہی کرتے اور آداب وتسلیمات سے دنیا میں ایک دوسرے کا استقبال کرتے تھے۔ تلخیوں کو نظر انداز کرتے تھے۔ شب وروز کے اوقات میں اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہوتے تھے۔ آج اسی شیریں عمل کا صلہ دیکھیں گے کہ ہر طرف سے ان کو آداب وتسلیمات سے پکارا جائے گا۔ دنیا میں ایک دوسرے کو دعاؤں میں یاد رکھتے تھے۔ تقویٰ اور اطاعت میں ایک دوسرے سے بڑھنے کا شوق تھا جس میں نہ حسد ہے نہ کینہ۔ اپنی اولاد کو متقی لوگوں کا پیشوا بنانے کی دُھن تھی۔ نہ شریکے کی ضد تھی، نہ مال ودولت جمع کرنے کا زُعم، نہ جاہ وحشمت کی مسابقت اور نہ ہی سابقہ احسانات کو جتانے کا عیب تھا۔ سب کی ایک ہی لگن تھی کہ کون زیادہ اچھے عمل کرلے۔ دوسرے کو عطا کرکے، معاف کرکے اپنے کردار کو چشمۂ صافی بنالے۔

میاں بیوی ہوں یا ان کے حوالے سے دیگر رشتے، ہر ایک رشتے کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وہ ذات ہے جس نے زندگی اور موت کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ دیکھے، آزمائے تم میں سے کون زیادہ بہتر عمل کرکے آتا ہے۔'' (الملک)

جب اپنے مفادات پر زد پڑتی ہو تو کون ''احسن عملاً'' کی کوشش کرتا ہے۔ معاملہ بہتر عمل کی تلاش، کوشش اور پھر اس پہ استقامت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں کون زیادہ اچھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی جنت کا کون زیادہ مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کا کون زیادہ امیدوار ہے۔ تلخیوں، شکووں کو نظر انداز کرکے کون ان ہمیشگی کے اچھے مقامات، پائیدار عزت کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رشتوں ناتوں، مزاجوں کا اختلاف، قوموں، قبیلوں، رنگ ونسل کی رنگا رنگی محض تعارف وپہچان اور آزمائش کے لئے ہے کہ کون تقویٰ کے اس معیار پہ پہنچتا ہے جس کی جزا جنت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اس سے بھی بڑھ کر نعمت ہے۔ یہ

نعمت ان کو ملے گی جو غصہ، انتقام اور بدلہ لینے کے حق رکھنے کے باوجود درگزر کریں گے۔

رشتوں کے درمیان منفی خیالات وجذبات کا آنا غیر فطری نہیں ہے۔ ان کی آڑ بنا کر رشتوں سے منہ موڑنا غیر فطری اور غیر مستحسن ہے۔ انسانی جذبات میں منفی طرزِ عمل ہی باور کراتا ہے کہ ہمارا ٹارگٹ کیا ہے؟ کس کو چھوڑ کر کیا حاصل کرنا ہے؟ اختلافات وانتشار میں قرآنی اور ربانی فیصلے کا اختیار نفس کو دیا جائے یا پھر اُس احکم الحاکمین کو جس کی طرف سارے معاملات لوٹائے جائیں گے۔ جہاں کسی پر ذرہّ برابر ظلم نہ ہوگا۔ جہاں ایسی کتاب سے واسطہ پڑے گا جس میں ہمارے ہر چھوٹے بڑے عمل کا اندراج ہوگا۔ اور جہاں رحمٰن ورحیم اپنے خالص بندوں کی عزت افزائی فرمارہا ہوگا۔

اسی عزت افزائی کو حاصل کرنے کے لئے اس دنیا کی جھوٹی عزتوں کو قربان کرنا پڑے گا۔ ان کے بت کو پاش پاش کرنا ہوگا۔ دوسروں کی کمزوریوں کو نظرانداز کرکے تحمل اور برداشت کا کلچر رواج دینا ہوگا۔ ہر شخص حقوق دینے کے فرائض ادا کرنے کی فکر کرے۔ لینے اور حاصل کرنے کی پالیسی کے بجائے دینے اور ایثار کرنے کی پالیسی پہ عمل کیا جائے۔ اختلاف رائے کو زحمت کے بجائے رحمت بنایا جائے۔ متضاد چیزوں اور رویوں کے ساتھ بہتر حکمت عملی اپنا کر معاونت کی راہ تلاش کی جائے۔ یگانگت اور بھائی چارے کے میٹھے چشمے انہی تضادات کے کھاری پانی اور نمکین پانی کے اندر ہیں۔ کھاری پانی کو میٹھا بنانے کے لئے سائنسی طریقے انسان نے ایجاد کر لیے ہیں تو ان رشتوں کی مٹھاس حاصل کرنے کے لیے قرآنی فارمولے پر ہی عمل کرنا ہوگا۔

گرتو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن بجز قرآں زیستن

☆☆☆

غزل

ہر پل اک ہنگامہ ہے، اک حشر بپا ہے
ہر پل اک اندیشہ دل کو چاٹ رہا ہے

میرے فرشتوں نے جانے کیا کیا لکھا ہے
میرے عمل کا نامہ جو تیار کیا ہے

کیسی ہوک سی اٹھی ہے ان شریانوں میں
دل کے دامن میں کیسا یہ چھید ہوا ہے

ایک ہنسی ہونٹوں پہ آ کے لوٹ گئی ہے
اِک آنسو پلکوں پہ آ کر ٹھہر گیا ہے

اپنی رحمت کو میرے اوپر پھیلا کر
میرے عیبوں کو مولا نے ڈھانپ دیا ہے

ہر اک نعمت اس کو واپس لوٹانی ہے
واپس کرنا ہے جو اس نے قرض دیا ہے

اک اک شے تو اس سے ہی نسبت رکھتی ہے
فطرت کا ہر ذرہ اس کے ساتھ جڑا ہے

(شمیم فاطمہ)

سودائے تعارف

گود میں ماں کی جب تک ہمکتی رہی
غنچہ و گل کی صورت مہکتی رہی
وقت بادِ صبا بن کے اُڑتا رہا
طفل نادان ہنستی چہکتی رہی
سر میں سودائے کوئے تعارف نہ تھا
کمسنی شوخیاں جب دکھانے لگی
بچپنے کی ادا دل لبھانے لگی
سکہ اپنے پرائیوں پہ چلنے لگا
نقش ہر دل پہ اپنا بٹھانے لگی
نطقِ معصوم وجہِ تعارف ہوا
پھر چمن در چمن پھول کھلنے لگے
سوئے چشمے زمیں سے ابلنے لگے
عمر کے ارتقاء کی بنی راز داں
رت نکھرنے لگی رنگ ابھرنے لگے
پیکرِ صنفِ نازک تعارف ہوا
عمر کی دھوپ اب جبکہ ڈھلنے لگی
پیر رکھنے سے پہلے سنبھلنے لگی
زندگی کے رویوں سے لی آگہی
پھر تجربوں کے گہنوں سے سجنے لگی
گھر گرہستی کا جوہر تعارف ہوا
آخرش جامِ ہستی چھلکنے لگا
تن کا سایہ بھی گھٹنے سمٹنے لگا
دل کو احساسِ سود و زیاں الاماں
کانٹا چبھنے لگا گل مہکنے لگا
کنیت زوجیت حاصل عافیت
کہیے کیا اپنا کیا کیا تعارف ہوا!

(نجمہ یاسمین یوسف)

سند

انٹر کام پر بیل ہوئی۔ثمر نے بٹن دبایا۔

''کون؟''

''باجی،کوریئر سروس سے آپ کے لیے ایک پیکٹ ہے۔''جواب دیا۔

مظہر کی ڈاک ہوگی یا غالبہ کے ڈاکومنٹس،ثمر دل ہی دل میں اندازہ لگاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔اور دروازہ کھولا۔

''باجی یہاں سائن کر دیں۔''اس نے ناموں کی فہرست والا کاغذ دستخط کروانے کے لیے آگے کیا۔

ثمر نے سائن کر کے کاغذ اسے واپس کیا اور ہاتھ بڑھا کر لفافہ لینا چاہا..... بھاری بھرکم پیکٹ ہاتھ میں آنے سے توازن گڑبڑ ہوگیا۔ثمر نے جلدی سے پیکٹ پکڑا.....اپنے اندازے کے غلط ہونے پر شرمندگی کی بجائے غصہ تھا۔ بھلا کوئی پوچھے قبل از وقت ایسے غلط اندازے لگائیں ہی کیوں؟

دروازہ بند کر کے ثمر بے تابی سے اندر آئی۔

پیکٹ پر بھیجنے والے کے نام کی جگہ پر مسز عبیدالرحمان لکھا ہوا تھا ..... نام دیکھتے ہی ثمر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

ہائے میں صدقے، میری اکلوتی نئی نویلی بھابھی نے پہلی دفعہ مجھے اتنی دور سے تحفہ بھیجا .....ثمر نے پیکنگ کھولی ..... بے حد خوبصورت شفون کے دوپٹے والا الکرم کا سوٹ تھا..... ہلکے گلابی اور آسمانی رنگ میں انتہائی نفیس کڑھائی اور کامدانی کے چھینٹے کے ساتھ جھلمل کرتا سوٹ صرف رات کے ہی نہیں دن کے فنکشنز میں بھی زبردست تھا۔ ساتھ ہی میچنگ کی چوڑیاں اور جوتا بھی تھا.....

جس رشتے سے یہ تحفہ ہانیہ نے بھجوایا تھا اور جس چاہت سے بھجوایا تھا سچ مانو تو اندر تک ٹھنڈ پڑ گئی ۔ آنکھوں میں ستاروں کا اک قافلہ سا اتر آیا.....!!

مظہر کے آنے تک ہواؤں میں اڑتی رہی..... بے موقع اور غیر متوقع تحفہ کسی نند کو کیا خوشی پہنچا سکتا تھا یہ کوئی اس سے پوچھے!!!

جونہی مظہر کے آنے کا الارم بجا گاڑی لاک کر کے وہ اندر داخل ہوئے چھوٹی فاطمہ شرارت سے آنکھیں پٹپٹا کر بولی۔

''ابو بوجھیں تو سہی آج امی کو کیا ملا ہے؟''

مظہر نے بیوی کی طرف دیکھا اور ہنس کر کہا۔

''کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔''

غالبہ نے بیچ چوراہے میں بھانڈا پھوڑا۔

''ابو، ابو امی کو مامی جان نے سوٹ بھیجا ہے۔ ساتھ میں چوڑیاں اور میچنگ کی چپل بھی.....''

''واہ.....وَ.....کاش ہماری بھی کوئی ایسی مامی جان ہوتیں .....'' بیوی کی طرف شرارت سے دیکھ کر مظہر مصنوعی صدمے سے بولے۔

فاطمہ لوٹ پوٹ کر ہنس رہی تھی.....

آپ کی مامی جان تو فوت ہو گئیں.....آپ کی مامی جان تو فوت ہو گئیں ..... آپ کو کون سوٹ دے گا.....!!

سبھی ہنس پڑے.....!!

سوٹ مظہر کو بھی بے تحاشا پسند آیا.....!!

اچھا بھئی انھوں نے صوفے پر ریلیکس ہوتے ہوئے کہا۔ آج چائے پانی کا ناغہ ہے سوٹ کی خوشی میں یا.....؟؟؟

''ناغہ کیوں! عجیب بات کرتے ہیں آپ، آج تو صفیہ آپا کے ہاں ہماری دعوت ہے ادھر جانا ہے.....!!''

''اوہ.....مظہر کو ایک دم یاد آیا.....''

اچھا تم بچوں کو تیار کرو میں فریش ہو کے آتا ہوں .....راستے سے مٹھائی کی بجائے پھل لے لیں گے آپا کے لیے.....۔

صفیہ آپا ثمر کی بڑی نند تھیں ..... گھر کی تنہائی سے گھبرا کر انھیں اکثر موقع بے موقع دعوتوں کے دورے پڑتے ہی رہتے تھے۔ اب تو اچھا خاصا بہانہ تھا ان کی اکلوتی بیٹی عرصہ دراز کے بعد شارجہ سے واپس آئی تھی۔ ایک طرح سے یہ پورے خاندان سے ملنے ملانے کا بہانہ تھا۔

دعوت کا انتظام اور کھانا حسب سابق بہت اچھا تھا .....!! دعوت کے بعد پتہ ہی نہ چلا کب رات بھیگ چلی ..... جلدی جلدی کرتے بھی رات کے دس گیارہ بج چکے تھے۔ بچے اور مظہر گاڑی میں بیٹھ چکے تھے جب صفیہ آپا اور ان کی بیٹی منزہ باہر آئیں اور ثمر کے ہاتھ میں خوبصورت سا شاپنگ بیگ تھمایا۔

یہ کیا ہے؟ اس نے سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھا۔

مامی جان آپ ہر دفعہ مجھے یاد رکھتی ہیں میں نے سوچا اس دفعہ میں آپ کو یاد رکھوں۔ اس نے مسکراتے ہوئے بات مکمل کی۔ یہ سوٹ ہے آپ کا۔ میں نے خود بہت چاہت سے خریدا ہے آپ کے لیے.....سلوا کر ضرور پہنیں.....

اف بھئی تم تو ننھی منی سی ہو بالکل میری غالبہ کی طرح ..... تمھیں سوٹ دینے دلانے کی کیا تک بنتی ہے۔ ثمر نے بظاہر خفگی سے کہا۔

''لے لو بھئی ..... کاش ہم بھی کسی کے مامی جان ہوتے.....'' ٹھنڈی آہ بھر کے مظہر نے ایکٹنگ کی۔

سارے ایک دفعہ پھر ہنس دیے۔

گھر پہنچے تو دروازہ کھلا تھا.....

ارے یہ تو میں لاک کر کے چابی منیبہ کو دے گئی تھی .....دل میں آنے والے خدشات کو قابو کرتے ہوئے داخل ہونے کی دعا پڑھی.....دایاں پاؤں اندر رکھا.....

''امی جان السلام علیکم .....!'' اندر اس کا شہزادہ مغیث تھا..... پڑھائی کے سلسلہ میں کراچی ہاسٹل میں رہتا تھا اور عموماً چار چھ ماہ کے بعد گھر آتا ..... چونکہ اسے یہ بات معلوم تھی کہ گھر سے باہر جاتے ہوئے بالعموم چابی منیبہ کو پکڑا کے جاتی ہیں لہٰذا اس نے سرپرائز دینے کے چکر میں آمد کی اطلاع نہ دی.....!!

غالبہ، فاطمہ تو بھائی کو دیکھ کر خوشی سے بے حال ہو رہی تھیں۔

بھیا آپ نے سرپرائز دیا ہے ناں اچانک اور بغیر اطلاع کے آ کر۔فاطمہ نے پوچھا۔

مغیث ہنس پڑا اور چاکلیٹ کا ڈبہ اس کے حوالے کیا۔

بھیا زندہ باد.....!اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔

''اور میرے لیے؟'' غالبہ چیخی۔

''یہ لو تمھارے لیے ..... پہلے بوجھو کیا لایا ہوں؟'' اس نے چڑایا۔ایپل پائی سے لے کر کھانے پینے کی پندرہ چیزوں کے نام غالبہ نے گنوائے مگر وہ صاف انکار کرتا رہا۔تھک ہار کے وہ بولی۔خود ہی بتا دیں۔

''یہ دیکھو میں کیا لایا؟'' اس نے غالبہ کی پسندیدہ رائٹرز کے دو تین ناول آگے کیے.....اردو بازار گیا تھا تمھارے لیے یہ خرید لیے.....!!

بھیا دی گریٹ، بھیا کتنے اچھے، غالبہ خوشی سے چہکی .....

مظہر قریب ہی بیٹھے خوش ہو رہے تھے.....سب کچھ بہت پرسکون تھا جب اچانک سرگوشی کے سے انداز میں مغیث نے کہا۔

''امی.....میں نے پہلی دفعہ عورتوں والی شاپنگ کی ہے طارق روڈ سے.....'' رکتے جھجکتے اس نے فقرہ مکمل کیا اور شاپنگ بیگ میں سے جدید پرنٹ اور سٹائل کا سوٹ نکال کے ثمر کو پکڑایا۔

بہت ڈیسنٹ کلرز میں سوٹ واقعی بہت پیارا لگ رہا تھا۔

امی! یہ آپ کے لیے خریدا ہے! اچھا لگا ناں آپ کو .....!!وہ آس نراس سے بولا۔

ثمر..... پہلے تو گم سم وہ سوٹ دیکھتی رہی پھر ایک دم اٹھ کر اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔

سبھی اس سچویشن پر ہکا بکا تھے.....!!

امی کیوں اٹھ کر چلی گئیں؟؟ تینوں پریشان تھے .....میں پتہ کرتا ہوں.....مظہر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

بیڈروم کا دروازہ ہلکی سی دستک سے کھل گیا۔

اندر کی صورت حال بالکل ہی الٹ تھی۔

ثمر کی آنکھوں سے آنسو جھرنے کی طرح بہہ رہے تھے.....وہ دونوں ہاتھ جوڑے ایک ہی فقرہ دہرا رہی تھی۔

مالک تیرا شکر ہے تو نے میری نیکی کو قبول کیا۔

مظہر نے اس کا شانہ ہلایا۔

''یار کیا ہو گیا؟ تم اٹھ کر کیوں آ گئی ہو۔''

آنسو اس کے رخساروں پر جم گئے تھے۔

مظہر اللہ جی نے میرا ہدیہ قبول کر لیا.....اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگ گئی ..... آپ جانتے ہیں اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہے ..... میں نے جو سوٹ بنوایا تھا حفصہ کی شادی میں پہننے کے لیے اور وہ صحیح نہیں سلا تھا..... میں نے درزی کو واپس دیا تھا.....آج صبح جب درزی وہ سوٹ لے کر آیا تو میں نے کھول کر دیکھا کوئی نقص تو نہیں .....سوٹ اتنا غضب کا تھا کہ میں درزی کو پیسے دے کر اندر واپس آئی تو کام والی ماسی اسے کھول کر دیکھ رہی تھی.....بس ایک لمحہ کے لیے مجھے اس کی آنکھوں میں حسرت ہی حسرت نظر آئی۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے سوٹ تہہ لگا کے رکھ دیا اور کام میں مصروف ہو گئی۔ میں نے اسے بلا کر پوچھا۔ عابدہ تمھیں سوٹ کیسا لگا؟

بہت خوبصورت ہے بی بی جی.....اللہ پہننا اوڑھنا نصیب کرے۔اس نے آہستہ سے کہا۔

تو تم اتنی افسردہ کیوں ہو؟

بیگم صاحبہ میری بیٹی کی شادی ہے.....سوچ رہی تھی اللہ اس کے نصیبوں میں بھی ایسے جوڑے لکھ سکتا تھا..... !!پر.....!!!وہ فقرہ مکمل کیے بغیر ہچکیوں سے رو پڑی۔

میں نے ایک سیکنڈ میں وہ سوٹ اس کے سپرد کر دیا۔ وہ غریب،نہیں باجی جی آپ نے بڑی محنت سے سلوایا ہے..... باجی جی بہت مہنگا ہے..... میں تو ماں ہوں ناں اس لیے.....

نہیں، میں نے یہ سوٹ واقعی بہت چاہت سے بنوایا ہے پر اب اس سے بڑھ کر چاہت یہ ہے کہ وہ یہ سوٹ پہنے .....سوٹ اسے پکڑاتے ہوئے دل نے ایک دم ٹوکا بھی تھا پر.....

نہ نہ کرتے بھی میں نے سوٹ اس کے حوالے کر دیا .....سوٹ اس کو پکڑاتے ہوئے ایک دفعہ کسک سی ہوئی اتنے اچھے سوٹ تم کون سا روز روز سلواتی ہو..... پر میں نے دے ہی دیا۔

اللہ آپ کو خوش رکھے باجی جی آپ کا دیا قبول کرے۔اس نے بے ساختہ مجھے دعا دی۔

اور.....اب .....اب اس ایک سوٹ کے بدلے میں اس اوپر والے نے ایک نہیں تین تین بہترین سوٹ اس سے کہیں زیادہ محبت اور چاہت کے ساتھ میرے حوالے کر دیے ..... ایک ہی دن میں شارجہ، گوجرانوالہ کینٹ اور کراچی سے سند دلوائی۔

مظہر! آپ کو نہیں پتہ میرا دل اس وقت کیا محسوس کر رہا ہے.....آنسو پونچھ کے وہ ایک دفعہ پھر سجدے میں گر گئی۔

ربیعہ ندرت

ملائیں ہاتھ تو خوشبو نہ ہاتھ کی جائے!

پچھلے کچھ دنوں سے میری طبعیت قدرے ناساز تھی۔تھکاوٹ کا احساس ہو رہا تھا اور بخار آنے لگا تھا۔ پہلے تو میں نے حسبِ سابق اسکو چنداں اہمیت نہ دی اور یہی سوچا کہ یہ تو معمول کی معمولی سی بات ہے۔ بخار کا کیا ہے، بن بلایا مہمان ہے.....مختصر سے عارضی قیام کے لیے آیا ہے۔ جیسے دبے پاؤں آیا ہے ویسے ہی دبے پاؤں چلا جائے گا۔آتا ہے تو آنے دو، جاتا ہے جانے دو،ہمیں اس سے کیا لینا دینا! لیکن چند دن کے بعد احساس ہوا کہ مہمان گرامی کے تیور کچھ اچھے نہیں اور شاید اس کا ارادہ مختصر قیام کا بھی نہیں۔ چنانچہ مذکورہ مہمان کی دراندازی اور اشتعال انگیزی کی شکایت لے کر ہم ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے اور انہیں بتایا کہ اس نامعقول نے ہمارے گھر میں داخل ہو کر پہلے تو اپنے قدم جمائے پھر اپنے رنگ دکھائے اور اب آنکھیں نکال نکال کر ہمیں ڈرا دھمکا رہا ہے۔ ہماری جان کو آرہا ہے ہم تو اس کے سامنے بے دست و پا ہیں اور مقابلے کی تاب نہیں رکھتے۔ ذرا آپ اس کا سدِ باب کیجیے۔

ڈاکٹر صاحب نے چند سوالات پوچھے۔ طبی معائنہ کیا۔ چند لمحوں کیلئے آنکھیں بند کر کے بحرِ حکمت میں غوطہ زن ہوئے اور پھر فرمانے لگے۔

''آپ کی حالت کے پیشِ نظر ہم آپ کو فوری طور پر ہسپتال کے فیملی وارڈ میں داخل کر رہے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب کا فرمان سن کر میرے میاں پریشان ہو گئے کیونکہ سی ایم ایچ کے فیملی وارڈ میں مردوں کا رہنا منع ہے۔ وہاں صرف عورتیں ہی مریض ہوتی ہیں اور عورتیں ہی تیماردار۔ اس وقت سرِ دست مجھے کوئی خاتون تیماردار دستیاب نہیں تھی۔ دونوں بیٹیاں بیرون ملک اور چھوٹی بہن کی طبیعت ناساز ۔ دل چاہا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں درخواست پیش کروں کہ فی الحال فدویہ کو گھر جانے کی اجازت دے دیں۔لیکن لب کشائی نہ کر سکی اور ایک بے بس، کمزور لیکن اچھے مریض کی طرح خاموش رہنا بہتر سمجھا جو کہ سرِ تسلیم خم کر کے ڈاکٹر صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا جاتا ہے۔

''منہ کھولو، کھول لیا۔ دوا کھا لو، کھالی۔شربت پی لو، پی لیا، انجکشن لگوا لو،لگوا لیا۔ہسپتال میں داخل ہو جاؤ ،ہو گئے۔مر جاؤ، مر گئے۔اللہ اللہ خیر سلاّ۔''

میں اپنے میاں کے ساتھ فیملی وارڈ میں داخل ہوئی تو نرس نے بتایا کہ چونکہ آج کل مریضوں کی تعداد

زیادہ ہے، جس کی وجہ سے کئی کمروں میں دو دو مریضوں کو داخل کیا گیا ہے۔ چنانچہ مجھے جو کمرہ دیا گیا، اس میں بھی ایک عمر رسیدہ مریضہ موجود تھیں۔ ان کی دیکھ بھال کیلئے ان کی جواں سال لڑکی تھی جس کا نام بتول تھا۔ وہ میرے میاں کے چہرے پر پھیلی ہوئی پریشانی کو بھانپ گئی اور انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہنے لگی۔

''انکل جی! آپ فکر نہ کریں میں آنٹی کا خیال رکھوں گی۔''

میرے میاں گھر جا کر میرے لئے ضروری سامان لے آئے۔ جب شام کے سائے گہرے ہونا شروع ہو گئے تو ملاقات کا وقت ختم ہو گیا تو میرے میاں بادلِ نخواستہ دوسرے دن آنے کا کہہ کر رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کی دیر تھی کہ میری ہمت بھی اندر ہی اندر جواب دینے لگی۔

ہسپتال کی انتظامیہ کی طرف سے معمول کے مطابق سب مریضوں کو رات کا کھانا دیا گیا۔ کھانے کے بعد نرسوں نے سب کو دوائیاں دیں اور پھر ہسپتال کی بتیاں گل ہو گئیں۔ ہر کمرے میں مدھم روشنی کیلئے ننھا منا سا بلب جل اٹھا۔ کمرے میں دیوار کے ساتھ ایک صوفہ پڑا تھا۔ بتول نے سونے کیلئے اس پر تکیہ رکھا اور لیٹ گئی۔ اس کی والدہ غالباً نیند کی دوائی کے زیر اثر تھیں۔ جلد ہی ان کے خراٹے گونجنے لگے۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے بخار کی تیزی کی وجہ سے شدید گرمی محسوس ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی متلی کا احساس ہوا اور میں گھبرا گئی۔ میں نے اپنے تئیں متلی کو سمجھانے بجھانے اور روکنے کی کوشش کی لیکن متلی کے مصمم ارادے نے مجھے یہ باور کروا دیا کہ اس ضمن میں ہر طرح کی کاوش بے سود ہے اور ہونی ہو کر رہے گی یعنی ؎

اتنا ہی یہ ابھرے گی، جتنا کہ دبا دو گے

میں بمشکل ہمت کر کے اٹھ بیٹھی اور بستر پر بیٹھے بیٹھے دامن پھیلا لیا تا کہ متوقع واردات کے دوران جائے وقوع کے رقبے کو مختصر اور محدود کرنے کی ہر ممکن پیش بندی کی جائے۔ اچانک کسی نے میری جھولی میں پلاسٹک کی ایک ٹوکری رکھ دی۔ اسکے ساتھ ہی ایک نرم و گداز شفیق ہاتھ میری پشت کو سہلانے لگا۔ پھر ایک ملائمت بھری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''آنٹی جی! بے فکر ہو کر الٹی کر دیں میں سب سنبھال لوں گی۔''

میرے پیٹ میں بھنور کی طرح چکر کاٹتی ہوئی قے شاید اسی جملے کی منتظر تھی۔ وہ ابھر کے تیر کی رفتار سے میرے منہ تک آئی اور پھر شہابِ ثاقب کی طرح سیدھی ٹوکری میں ڈھیر ہو گئی۔ بتول فوراً تولیے کا کونہ بھگو کر لائی اور اس نے میرا منہ ایسے ہی صاف کیا جیسے بچپن میں میری ماں کرتی ہوں گی۔ پھر وہ ٹوکری اٹھا کر غلسخانے کی طرف چل دی اور اسے دھو کر کمرے میں آئی۔ قے کرنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوں گویا

میرے سینے سے بھاری بوجھ ہٹ گیا ہو لیکن اب شرمساری کے بوجھ نے اس خلا کو پر کر دیا۔ کچھ دیر کے لئے میں گنگ سی ہو کر رہ گئی اور بتول سے نظریں چرانے لگی۔ پھر خیال آیا کہ جو بندوں کا شکر گزار نہیں وہ بھلا خدا کا شکر گزار کیسے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے کہا۔

''بتول! مجھے وہ الفاظ ہی نہیں مل رہے کہ جن کی مدد سے میں تمہارا شکریہ ادا کروں۔''

''نہ آنٹی جی نہ۔ شکریہ کا لفظ ماں کے منہ سے اچھا نہیں لگتا۔ یہ تو بیٹیوں کی زبان پر سجتا ہے۔''

دوسرے دن صبح میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی کہ وہ تولیہ بھگو کر لے آئی اور مادرِ مہربان کی طرح میرے ہاتھ منہ صاف کرنے لگی۔ پھر کہنے لگی۔

''آنٹی جی! ذرا ہمت کر کے صرف پانچ منٹ کے لئے بیٹھ جائیں۔ میں آپ کے بالوں میں کنگھی کر دوں۔'' میں نے بہتیرا انکار کیا لیکن اس کی تکرار کے سامنے مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

کچھ دیر کے بعد ناشتہ آ گیا۔ اس نے انڈے چھیلے، ڈبل روٹی پر جیم لگایا اور میرے سرہانے آن کھڑی ہوئی۔

''اٹھیں آنٹی جی! ناشتہ کر لیں۔''

میں نے اسے بتایا کہ میرا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہتا لیکن اس کا اصرار بڑھتا چلا گیا اور میں نے چند لقمے لے لیے۔

جب دوپہر کو دھوپ خوب نکھر کر بکھر گئی تو وہ مصر ہوگئی۔

''آنٹی جی! میں باہر دھوپ میں آپ کے لئے کرسی رکھ آئی ہوں۔ چلیے آپ کو لے چلوں۔''

میں نے کہا ''بیٹی! تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میری ناتوانی کا کیا عالم ہے۔ میرے لیے چند قدم اٹھانا بھی بہت مشکل ہے۔''

وہ کہنے لگی ''میں آپ کو سہارا دوں گی، بالکل دقت نہ ہوگی۔ آپ کی صحت کے لئے دھوپ بہت مفید ہے۔ اس لیے آپ کو ضرور جانا پڑے گا۔''

یہ کہہ کر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے سہارا دے کر مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ میرے اردگرد اپنے دونوں بازوؤں کا گھیرا بنایا اور مجھے لے جا کر کچھ دیر کیلئے دھوپ میں بٹھا دیا۔

شام کے پچھلے پہر بخار پوری شدت سے مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ میرے جسم میں درد نے برسات میں جا بجا خودرو اگنے والوں پودوں کی طرح سر اٹھایا۔ میں نقاہت کے مارے نیم جاں سی ہو کر رہ گئی۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنا رخ دیوار کی طرف پھیر دیا اور آنکھیں موند لیں۔ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نرم وگداز اور شفیق ہاتھوں نے بہت اپنائیت سے میری ٹانگوں کو تھام لیا۔ پھر وہ ہاتھ آہستہ آہستہ میری ٹانگیں

دبانے لگے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ شاید میں نیم غنودگی کے عالم میں محوِ خواب ہوں لیکن جلد ہی یہ خیال جاتا رہا۔ وہ ہاتھ میری ٹانگوں میں سے درد، تھکن اور دکھن کو چن چن کر مجھ سے دور کر رہے تھے اور ان کی انگلیوں کی پوروں میں سے سکھ اور سکون قطرہ قطرہ چھن چھن کر میری رگ وپے میں سرایت کر کے میرے وجود کو سیراب کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی مسیحائی کی تاثیر سے میرا دل بھیگ رہا تھا میں سوچ رہی تھی کہ جیسے انسانی زبان الفاظ کے ذریعہ مافی الضمیر بیان کرتی ہے، جیسے چہرے کے تاثرات دلی جذبات کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔ جیسے ہماری آنکھیں بھی تہہ درتہہ چھپے ہوئے دکھ سکھ کی خاموش کہانیاں بیان کرتی ہیں، اسی طرح انسانی لمس بھی ان کہے پوشیدہ احساسات کا عکاس ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ محبت اور اپنائیت سے بھرپور انسانی لمس سے بڑھ کر کوئی دوا دارو زود اثر نہیں۔

اپنے بستر پر لیٹے لیٹے بتول کو دیکھ دیکھ کر میں حسرت سے یہی سوچتی رہی کہ اگر ہم سب کے دل بھی بتول کے دل جیسے نرم، حساس اور خوبصورت ہوتے تو روئے زمین پر کبھی کسی یتیم خانے یا اولڈ پیپلز ہوم کی داغ بیل نہ ڈالی جاتی۔ ہم اپنے بزرگوں ، بچوں، کمزوروں اور بے نواؤں کو محبت، شفقت اور اپنائیت سے دامنِ دل میں جگہ دے دیتے اور ان کو بے یارومددگار، دربدر اور گھر بدر کر کے حسرتوں، محرومیوں، اندیشوں، خوف، کمتری اور بے اعتمادی کے سائے تلے نہ چھوڑ دیتے۔

بتول نے پانچ چھ دن تک خوب دلجمعی سے میرا خیال رکھا۔ اس دوران میری حالت بہتر ہوگئی اور میں بستر سے اٹھ کر چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی۔ بتول کی والدہ کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔ بتول نے اپنا سامان سمیٹا اور گھر جانے کیلئے تیار ہوگئی۔ جاتے جاتے افسردہ لہجے میں مجھ سے کہنے لگی۔

''آنٹی جی! اب میں آپ کو چھوڑ کر جارہی ہوں۔ اگر آپ کو میری ضرورت محسوس ہوئی تو فون کر دیجیے گا۔''

''میری بچی! اب میں بہت بہتر ہوں۔ جتنے دن کمزوری کی وجہ سے مجھے سہارے کی ضرورت تھی، اللہ نے تجھے میری لاٹھی بنا دیا۔ یہاں آتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں اسے فون کیا تھا، چنانچہ میری ضرورت کے تحت اس نے تجھے میرے پاس بھیج دیا۔ خدانخواستہ اگر پھر ضرورت آن پڑی تو تب بھی اسی کو فون کر دوں گی۔ وہ پھر تجھے یا تیرے جیسی کسی خوش بخت کو بھیج دے گا۔ کہ اس کے بے شمار مددگار لشکر ہر آن کان لگائے، ایڑیوں کے بل، مہر بلب اس کے حکم اور اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔''

بتول نے اپنا سامان اٹھایا اور خدا حافظ کہہ کر چلی

گئی۔اس کے جانے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرے وجود کے اندر کوئی چیز ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگئی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ پگلی! اس دنیا کی چندروزہ زندگی میں کسی رشتہ، واسطہ، رابطہ، تعلق، دوستی اور دشمنی کو دوام نہیں۔ یہ سب کچھ ایک مقررہ اور طے کردہ مدت کے بعد مٹ جانے والا ہے، ختم ہوجانے والا ہے، جدا ہوجانے والا ہے، فنا کے گھاٹ اتر جانے والا ہے۔ یہاں چل چلاؤ کا میلہ ہے۔ یہاں تو ہر شے مسافر ہے، ہر چیز راہی۔اس لیے جانے والی کا غم کیا کریں۔ باقی رہ جانے والا تو صرف اور صرف تیرے رب کریم کا چہرہ ہے۔ بے پنا عظمت اور بے کراں بزرگی والا!

ہاں اس چندروزہ زندگی کے دوران جب دو انسان آپس میں ملتے ہیں تو دونوں فریق اس ملاقات کے نتیجہ میں کچھ نہ کچھ پاتے ہیں اور کچھ کھو دیتے ہیں۔ بعض اوقات کسی سے مل کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے دکھ، تکلیف اور غم دل کے نہاں خانے سے نکل کر کہیں کھو گئے ہیں اور کسی نے ہمارے زخمی دل پر مرہم کا لیپ کر کے ہمیں ہلکا پھلکا کر دیا ہے۔ کبھی کسی کی پرتاثیر اور دلپذیر معطر شخصیت مدتوں ہمارے جسم و جاں کا احاطہ کر کے ہمیں مشکبار کیے رکھتی ہے۔ ؎

کچھ ایسے بھی ہیں تہی دست و بے نوا جن سے
ملائیں ہاتھ تو خوشبو نہ ہاتھ کی جائے

بسا اوقات کسی سے مل کر یوں محسوس ہوا ہے کہ جیسے کسی کے الفاظ کی انی ہمارے کانوں میں پگھلا ہو سیسہ انڈیلتی ہوئی ہمارے دلوں کو گھائل کرتی چلی جاتی ہے۔ جیسے ہمارا سکون اور خوشیاں بھاپ بن کر بادلوں کے پار جا چکے ہیں اور ہمارے وجود میں دکھ اور غم کی کانٹے دار فصل ابھر کر چھا گئی ہے۔

ہسپتال میں میری اور بتول کی چندروزہ صحبت ہم دونوں کیلئے نعمت بن گئی۔ وہ ایک اجنبی اور ناآشنا عورت سے جھولیاں بھر بھر کے دعائیں لے کر رخصت ہوئی اور میں اس کی نرم خو اور ہمہ صفت شخصیت سے مستفید ہوکر اس کے بارے میں بہت خوبصورت یادیں لے کر گھر لوٹی۔

ہسپتال سے گھر آنے کے بعد ایک دن میری ایک ہمسائی عیادت کے لئے آئی۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگی کہ اس ناتوانی اور کمزوری کے عالم میں تم نے اپنی بیٹیوں کو خوب یاد کیا ہوگا کہ اگر وہ تمہارے آس پاس ہوتیں تو کس محبت سے تمہاری دیکھ بھال کرتیں۔

میں نے بے اختیار جواب دیا۔

''نہیں، نہ جانے اس دوران وہ مجھے کیوں یاد نہیں آئیں۔''

اس نے حیران ہوکر پوچھا۔

''بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔''

اس کے حیرت زدہ اور مشکوک لہجے کی وجہ سے دل ہی دل میں شرمسار ہو کر سوچنے لگی کہ شاید اس ضمن میں بحیثیت ایک ماں مجھ سے فرائض کی ادائیگی میں کچھ کوتاہی ہوگئی ہے۔ اصولاً تو اس دوران مجھے اپنی بیٹیوں کو بہت یاد کرنا چاہیے تھا۔ زبان سے نہ سہی، دل ہی دل میں کیونکہ یادآوری، اشک شوئی اور آہیں بھرنے کا یہ سنہری وقت تھا۔ کہ رسم دنیا بھی ہے، موقع بھی تھا، دستور بھی ہے، تب نہیں یاد کیا تو کب یاد کروں گی۔ پھر جب میں نے غور کیا تو مجھے اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

میری پیاری بیٹیاں بھلا مجھے کیسے یاد آ سکتی تھیں۔ بتول جو میرے اور ان کی یاد کے بیچ میں سدِ سکندری بن کر کھڑی ہوگئی تھی۔

☆☆☆

احساس

شام ہونے کو تھی، جس کا احساس پرندوں کی چہچہاہٹ سے زیادہ نمایاں تھا۔ وہ درختوں پر اپنی جگہ بنا رہے تھے۔ مزدور کندھوں پر کدال اٹھائے۔ مسافر سروں پر رومال ڈالے، بچے ماؤں کا ہاتھ تھامے پارکوں سے واپس جا رہے تھے۔ لیکن مانی ابھی تک اسکول سے نہیں آیا تھا۔

ماں نے پریشانی کے عالم میں بے شمار دفعہ باہر جھانکا لیکن وہاں سب ہی تھے سوائے مانی کے۔

کہاں جاؤں؟ کس سے کہوں؟ اشکبار آنکھوں سے سوچا کہ نفل پڑھ لوں لہٰذا مصلہ بچھایا، نفل مانے، دعائیں مانگیں اور آنسوؤں کے سیلاب میں زندگی کے اوراق ڈبونے لگی۔ اسی رات کی تاریکی میں مانی نے بند کمرے کے دروازے کی اوٹ سے جھانکا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ امی اکیلی ہیں یا ابو بھی ہیں۔ کمرے میں صرف امی ہی نظر آئیں۔ وہ بھی اکیلی ہمت کر کے دروازہ کھٹکھٹایا، امی نے چونک کر دیکھا، دروازہ کھولا تو ماں کے چلانے پر غصے اور خوشی کے آثار نمایاں تھے۔ مانی ڈر گیا۔ کچھ بولا نہیں خاموش کھڑا رہا۔ ماں نے اسے غصے سے کھینچ کر اندر کیا۔

''صبح سے کہاں تھے تم؟ دیکھو کیا بجا ہے؟ بتاؤ، مجھے بتاؤ۔''

وہ نظریں نیچی رکھ کر بولا ''نانی اماں کے گھر چلا گیا تھا۔''

''لیکن کیوں؟ مجھے بتایا کیوں نہیں؟ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں تمہارا انتظار کرتی رہی ہوں۔''

''آپ کو بتاتا تو آپ منع کر دیتیں۔'' وہ شرمندگی سے بولا۔

''لیکن تم کب وہاں گئے تھے، میں نے دوپہر کو انہیں فون کیا تھا اس وقت تو تم وہاں نہیں تھے۔''

بغیر جواب دیئے وہ آگے بڑھا تو ماں نے اس کو کھینچا ''نہیں تم مجھے سچ سچ بتا دو، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔'' پھر رک کر بولیں ''تم سکول بھی جاتے ہو یا نہیں؟''

''امی دو دن سے نہیں گیا۔'' اسے لگا جیسے وہ کچھ چھپا رہا ہے۔

''دو دن سے.....'' اس نے حیرانگی سے وہی جملہ دہرایا۔ ''تو تم کہاں رہتے ہو؟''

''امی مجھے سکول اچھا نہیں لگتا، ٹیچر ذرا ذرا سی بات پر مارتے ہیں، گالیاں بھی دیتے ہیں۔''

''تو بیٹا مجھے بتاتے۔'' انہوں نے آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کے ساتھ اس کو چمٹا لیا۔ ''میں اسکول

جا کر تمہارے ٹیچر سے بات کرتی یا تمہارے ابو چلے جاتے۔''

''میں اب سکول نہیں جاؤں گا۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

اس نے اسے پیار کیا۔''دیکھو میں نے تمہیں ہمیشہ یہ بات سمجھائی ہے کہ جو بھی ہو سکول میں گھر میں یا کہیں دوستوں کے ساتھ جاؤ مجھے ہر بات بتاؤ گے، کہیں جانا ہو بغیر بتائے مت جانا، تمہیں پتہ نہیں ہے میں کتنی پریشان ہوتی ہوں یا پھر ابو کو ہی بتا دیتے۔''

''ابو کو.....ہوں۔'' اس نے گردن کو جھٹکا دیا۔

ابو تو مجھ سے کبھی کچھ بولتے بھی نہیں ہیں، رات کو آتے ہیں جب میں سو رہا ہوتا ہوں۔صبح وہ سو رہے ہوتے ہیں جب میں اسکول چلا جاتا ہوں۔''

''چلو خیر، اب کبھی یہ حرکت نہ کرنا۔ جاؤ جا کر لیٹو میں بھی آتی ہوں۔''

رابعہ کو اس پر ترس بھی آیا۔اس نے اسے کیوں مارا؟ روتے ہوئے اسے یاد آیا ایک دفعہ جب اسکول میں کوئی فنکشن تھا اور مانی کو بھی انعام ملنا تھا اس وقت سب کے والدین کو بھی بلایا گیا تھا۔ مانی نے کارڈ لا کر بڑی خوشی خوشی ابو کو دکھایا تھا اور ان سے پوچھا تھا''آپ آئیں گے نا؟''تو ابو نے کہا تھا۔اس دن کو میری بڑی ضروری میٹنگ ہے اور مجھے بہت جلدی جانا بھی ہے، امی کو لے جانا۔''

لیکن اس دن امی بھی نہ جا سکیں، اس کے دوستوں اور ٹیچرز نے مانی سے پوچھا تو وہ بڑا شرمندہ ہوا لیکن گھر آ کر وہ خاموش خاموش سا گم سم اپنے کمرے میں بند رہا۔

رابعہ کو اس بات کا احساس تھا۔اس نے آصف سے شکوہ کیا کہ آپ مانی کی کسی موقع پر حوصلہ افزائی نہیں کرتے تو یہی بات لڑائی کا باعث بن جاتی۔

بجائے اس کے کہ آصف نہ جانے پر افسوس کرتے اور مانی سے اسکول کے حالات پوچھتے۔ انہوں نے ساری ذمہ داری رابعہ پر ڈال دی اپنی مصروفیت کی لمبی چوڑی لسٹ، کام اور دفتر کی پریشانیاں۔رابعہ نے بات بڑھانے کے بجائے صبر کے گھونٹ پیئے اور سوچا کہ آج کا واقعہ آصف کو اگر بتایا تو الٹا سب کچھ میرے ہی اوپر آ جائے گا لہٰذا اس نے صرف اتنا کہا کسی دن اسکول جا کر مانی کی پڑھائی کے بارے میں معلومات کر لیں۔

''لیکن یہ کام تم بھی کر سکتی ہو۔'' آصف کا ہمیشہ کی طرح ایک ہی جواب تھا۔''پتہ نہیں ہے میں کتنا مصروف ہوں۔'' رابعہ نے غصے سے کہا''آصف اگر میں گئی تو وہ مانی کا سکول میں آخری دن ہوگا۔''

''کیوں؟اس لیے کہ تم کو وہ سکول شروع سے ہی ناپسند ہے۔'' آصف نے کہا۔

وہ آہستگی بولی''آصف !مانی جو حالات بتاتا ہے، وہ کبھی سنیں اس سے لیکن آپ کو تو کچھ پوچھنے اور سننے کی

ضرورت ہی نہیں ہے۔'' یوں یہ بات بھی جب بڑھی اس کا اختتام بھی ہمیشہ کی طرح آصف کے چیخنے اوررابعہ کے رونے پر ہوا۔

مانی ایک حساس بچہ تھا۔ وہ ہر بات سمجھتا تھا کیونکہ اب وہ چھوٹا بھی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ زیادہ تر لڑائی اس کی وجہ سے ہوتی ہے۔لیکن حالات پر اس کی گرفت بہت کمزور تھی۔ وہ کیا کرتا اسے نہ گھر پسند تھا نہ اسکول۔ باپ سے زیادہ اسے ماں سے ہمدردی تھی اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی ماں روشن دماغ اور کھلے دل کی مالک ہے۔ وہ حقیقت کی دنیا میں رہتی ہے اسے زمانے کی اونچ نیچ کا بہ خوبی علم ہے اس کے برعکس باپ ضدی، غصے والے، مصروف، ہر طرف سے بے نیاز اور اکڑ والے انسان تھے۔

یوں متضاد مزاج ہر موقع پر آڑے آتے۔

اسکول میں داخلے کے وقت رابعہ نے کہا تھا ''آصف بچے کے لیے سکول اچھا ہونا چاہیے۔''

''اچھے سے تمہاری مراد کیا ہے؟ کیا ہم نے خراب میں پڑھا ہے؟''

''آصف! اب وہ حالات نہیں جب ہم نے گورنمنٹ اسکولوں سے پڑھا تھا۔ آپ جا کر دیکھیں ایک کلاس میں بے شمار بچے ہوتے ہیں۔ زمین پر بیٹھتے ہیں نہ پینے کو ٹھنڈا پانی ہوتا ہے نہ ہوا۔ اکثر بچے درختوں کے نیچے بیٹھے ہوتے ہیں۔''

''تو کیا ہوا؟ وہ بھی تو بچے ہیں۔''

''اسکول کو قریب ہونا چاہیے نا کہ اچھا اور ائیر کنڈیشنڈ۔'' آصف نے فیصلہ سنا دیا۔

رابعہ کے خیال میں بچوں کے لئے سیر و تفریح کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔لیکن آصف کو بچوں کا گھر میں رہنا پسند تھا۔ جبکہ وہ خود ہمیشہ گھر سے باہر ہوتے۔ ماں کے خیال میں باپ کا بھی بچے پر توجہ دینا اتنا ہی ضروری تھا جتنا ماں کا لیکن آصف کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ یہ سب وہ آصف کو سمجھانے کی بہت کوشش کرتی لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلتا۔

آج بھی رابعہ نے آصف کو سمجھانے کی کوشش کی تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ بات اتنی بڑھی کہ نوبت لڑائی پر آ کر ختم ہوئی۔ آصف خوب چیخے اور رابعہ خوب روئی۔ یہ سب سن کر مانی ڈر گیا مانی نے رضائی اپنے منہ پر ڈال لی لیکن وہ سب سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوتا ہے۔ ''کیا میں پڑھنا چھوڑ دوں؟''

لیکن بات صرف پڑھائی کی نہیں ہے تو کیا میں یہ گھر ہی چھوڑ دوں۔ وہ سوچتا رہا اور وہ ابھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اسے نیند آ گئی۔ سوتے میں اس نے خواب دیکھا اور ایک چیخ ماری اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

رابعہ نے اسے چمٹا لیا اور پوچھا ''کیا ہوا مانی؟'' مانی نے بتایا کہ میں نے خواب دیکھا تھا اس نے خواب سنانا شروع کیا ''میرے پر نکل آئے ہیں اور میں

بادلوں میں آسمان پر اڑ رہا ہوں ۔ وہاں پھولوں سے بھرے ہوئے باغ ہیں اچھے اچھے لوگ ہیں پیارے پیارے بچے ہیں جھولے ہیں بڑے بڑے پھلوں والے درخت ہیں، چاند ستارے ہیں میرے ساتھ اڑ رہے ہیں، بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلی، مجھے بڑا مزہ آیا لیکن وہاں آپ نہیں تھیں، یہ خیال آتے ہی میں نے نیچے جھانکا آپ کو ڈھونڈنے کے لئے تو میں اک دم سے نیچے گر گیا۔ میرا سارا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔''

''نہیں بیٹا! تم سچ مچ نہیں گرے۔ میں تمہیں گرنے نہیں دوں گی۔ خواب تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تم ڈر گئے ہو۔ اب روؤ نہیں سو جاؤ، صبح کو ہم خوب باتیں کریں گے، میں بھی اپنے خواب تمہیں سناؤں گی۔'' رابعہ نے مانی کو خوب پیار کیا اور چمٹا کر سلا دیا لیکن وہ خود جاگتی رہی، کس کو اب نیند آتی، خیالات نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔

اس نے سوچا میں نے بھی تو بہت سے خواب دیکھے تھے، اچھے اچھے، آسمانوں کی سیر کی تھی، کہکشاؤں سے دوستی کی تھی، ستاروں نے گدگدایا تھا۔ چاندنی برسی تھی، پروا جھوم کر آئی تھی، اس آنگن میں جو میرا گھر تھا۔ لیکن وہ سب بھی خواب تھا اگر حقیقت ہوتی تو یہ گھر خوشیوں کا گہوارہ ہوتا، پیار برستا، زندگی مسکراتی، قہقہے گونجتے، لیکن یہ صرف ایک گھر ہے، ایک چار دیواری، جہاں طرح طرح کے لوگ ہیں، ایک دوسرے کی ضد، زندگی جسے گاڑی کے دو پہیے کہا جاتا ہے، جو ہموار ہوں تو گاڑی بھی چلتی ہے۔ لیکن جب ان میں کوئی ہمواری نہ ہو تو وہ کیسے چلیں گے، زندگی یوں ہی ڈانواں ڈول رہے گی۔ یہی ناہمواری بچوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کو ہموار سطح خوشگوار ماحول اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب نہ ملے تو ان کی شخصیت منتشر ہو جاتی ہے، وہ ڈرے ڈرے سہمے سہمے زندگی کی دوڑ میں قدم رکھتے ہیں اور گرتے پڑتے آگے بڑھتے ہیں۔ ماحول سے فرار چاہتے ہیں ان سوچوں کے ساتھ۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے جی بھر کے دعائیں کیں۔ وہ تمام رات جاگتی رہی اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر اپنے بچے کے بہتر مستقبل کے لئے نوافل ادا کرتی رہی کہ اللہ تعالیٰ آصف کی پریشانیاں دور کریں اور وہ بچے پر توجہ کریں اس کی بات صبر سے سنیں۔

ڈرتے ڈرتے صبح اس نے آصف کو مانی کے حالات بتائے۔ وہ یہ سب سن کر کچھ پریشان نظر آئے تو رابعہ کی ہمت ہوئی کہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لے۔ اللہ نے اس کی دعا سن لی تھی۔ ہوا بھی یہی شروع دن سے لیکر آج تک اس نے نہایت صبر سے اپنی اور مانی کی زندگی کو کھنگال ڈالا۔ اس نے آصف کو احساس دلایا کہ بچے بیچ دنیا کے چھوڑ دینا یا قتل کر دینا ہی شقی القلبی نہیں ہے بلکہ بچوں سے لاپروائی بھی شقی القلبی ہے۔ مانی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اگر ہم نے اس کے بارے میں

یہی رویہ رکھا تو ہم اسے کھو دیں گے۔

وہ بولتی رہی آصف سب کچھ سنتے رہے۔ پہلا موقع ایسا تھا جب ماں باپ میں کوئی فیصلہ کن بات آرام سے ہوئی۔

مانی نے بند کمرے کی درز سے جھانکا پھر تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ مسکرایا ''اللہ تیرا شکر ہے بغیر لڑائی کے کام ہو گیا۔''

اور دروازہ بند کر کے آرام سے سو گیا۔

☆☆☆

توقیر عائشہ

وقت پر کافی ہے قطرہ

بچپن کے دن بڑی ہی لاپروائی کے دن ہوتے ہیں مگر ان دنوں کی سنی ہوئی باتیں ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں گہرا سا گھر بنا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ زندگی کے نشیب وفراز سے پڑنے والی گرد انھیں اور بھی مضبوط حصار مہیا کرتی جاتی ہے اور کبھی کچھ ایسی بات ہو جاتی ہے کہ یہ زیر زمین مکین اچانک اوپر اوپر ذہن کے پردے پر نمودار ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ جب ہم چھوٹے تھے مشترکہ خاندان ہی ہوا کرتے تھے اور ان میں پرورش پانے والے بچے کچھ زیادہ ہی متحرک ہوتے اور ہر وقت کسی نہ کسی اجتماعی سرگرمی میں مصروف رہتے۔ یہ ہی ہمارا بھی حال تھا۔ جب دادی اماں آواز دیتیں اور کوئی چھوٹا سا کام مثلاً میز سے چائے اٹھا دو یا کنگھا لا دو، بتاتیں تو ہم اپنے کھیل کود میں مست سنی ان سنی کر جاتے اور بعد میں یاد آتا تو ڈانٹ پڑنے کے خیال سے ان کی ضرورت کی کوئی اور چیز بھی ساتھ لے جاتے۔ مثلاً کنگھا مانگا تو اخبار اور چشمہ بھی لے جاتے ایسے میں وہ مسکراتیں اور ایک شعر پڑھ دیتیں۔

وقت پر کافی ہے قطرہ ابر نیک انجام کا
جل گئی کھیتی اگر برسا تو پھر کس کام کا

ہمیں اس کے معنی تو خاک سمجھ نہ آتے البتہ بعض دفعہ ہم بچے ان سے فرمائش کرتے۔ دادی جان وہی شعر پھر سنائیں نا پھر سب سبق کی طرح مل کر اس کو گاتے۔ اس وجہ سے یہ شعر پکا یاد ہو گیا تھا۔ آج وہ ''بڑے'' رخصت ہو گئے اور خود ہم ہی ''بڑے'' ہو گئے، اپنے بال بچے اور گھر بار لیے بیٹھے ہیں تو ایک بات ایسی ہوئی کہ یہ شعر اپنی پوری معنویت کے ساتھ مجسم ہو گیا اور مجھے شرمسار کر گیا۔

بات کچھ یوں ہے کہ صبح بچوں کے اسکول وین آنے کے وقت میں ساتھ ہی بڑے دروازے (gate) پر آ جاتی ہوں اور صبح کا لطف لیتی ہوں۔ جن افراد کے گزرنے کا معمول ہے وہ بھی اس وقت وہاں سے گزر رہے ہوتے ہیں ان ہی میں ایک ماں بیٹی بھی ہوتیں۔ ماں تو چادر منہ پر لپیٹے ہوتی لیکن اس کے ساتھ موجود پانچ چھ سال کی بچی کو میں غور سے دیکھنے لگتی۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری۔ سنہرے بال اور انتہائی سفید رنگ۔ حسین ہلکی براؤن آنکھیں اور دراز پلکیں۔ قدرت کا یہ شاہکار کسی کھاتے پیتے گھرانے میں ہوتا تو کیا کیا ناز اٹھائے جاتے .....مگر..... وہ کچرا چننے والیاں تھیں۔ کبھی جی

چاہتا کہ اسے روک لوں اور کچھ بات کروں مگر اگلے ہی لمحے طبیعت مکدر ہو جاتی۔ ان کا حلیہ اس قدر گندا ہوتا اور میری مجبوری یہ کہ بہت ہی نفیس مزاج جو اپنے پڑوس اور رشتہ داروں میں انتہائی صفائی پسند اور سلیقہ مند شخصیت کے طور پر جانی جاتی۔ بھلا میں ان بدبودیتی ہوئی ماں بیٹی کو قریب کیسے بلا سکتی تھی۔ اصل میں مجھے چیزوں کو صاف ستھرا رکھنا اور قرینے سے رکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے گھر کے در و دیوار پر کوئی دھبہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ ذرا کچھ رنگ خراب ہوا اور میں نے فوراً ہی رنگ و روغن کروا لیا۔ روزانہ استعمال کی اشیاء کبھی میلی حالت میں نظر نہیں آ سکتیں۔ کچن میں کوئی گندا برتن، کوئی میلا تولیہ ڈھونڈے سے نہیں مل سکتا۔ ٹی وی لاؤنج سے لے کر گیراج تک ہر چیز کی ایسی دیکھ بھال کہ سب کچھ نیا نیا سا لگتا۔ میری نند تو کہتی ہے کہ بھابھی اتنی صفائی والی ہیں کہ وال پیپر اور کیلنڈر تک کی روز ڈسٹنگ کرتی ہیں۔ بھابھی کا گھر تو شیشے کی طرح چمکتا ہے۔

ایسی باتیں سن کر ڈھیروں خون بڑھ جاتا بھلا اپنی تعریف کسے بری لگتی ہے۔ ہاں تو ایسا ہوا کہ ایک صبح میں بچوں کے ساتھ گیٹ کے پاس کھڑی تھی کہ وہ دونوں قریب آئیں۔ بچی نے ٹوٹی پھوٹی بولی میں مجھ سے کچھ کھانے کو مانگا۔ وہ شمالی علاقہ جات کی رہنے والی معلوم ہوتی تھیں۔ مجھ سے انکار نہ کیا گیا اور کچھ ناشتہ میں سے بچی چیزیں انھیں دے دیں۔ پھر میں انھیں آئے دن ہی کچھ نہ کچھ رات کا کھانا وغیرہ دے دیتی مگر باہر ہی۔ ان کی گندی حالت کے پیش نظر دو قدم بھی گیٹ کے اندر بلانا میرے لیے محال تھا۔ بس باہر ہی ٹھیک تھا۔

کئی دن سے بادل چھا رہے تھے لیکن برستے نہ تھے۔ سوچا آج اچھی طرح گملوں اور گیراج کی صفائی کریں۔ ماسی سے فرش دھلایا اور اسے رخصت کر کے نماز پڑھی اتنے میں بادلوں کی گرج سنائی دی۔ میں نے باہر جھانکا تیز جھکڑ چلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ میرے تو فرش ورش کی دھلائی سب برابر ہوگئی۔ اچانک دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اوپر ہی سے جھانک کر دیکھا تو وہی بچی اور اس کی ماں تھے۔ ان کے کپڑے بارش سے چپک گئے تھے اور آنکھیں کھل نہیں پا رہی تھیں۔ اپنی بولی میں وہ مجھ سے درخواست کر رہی تھیں کہ انھیں اندر بلا لوں۔ ان کا خیال ہوگا کہ میں انھیں کھانا پانی دیتی ہوں تو شاید اس وقت انھیں تیز بارش میں پناہ بھی دے دوں گی۔ لیکن..... بھلا میں ان کیچڑ بھری ماں بیٹی کو اندر کیسے بلا لیتی۔ میں نے اوپر ہی سے کہہ دیا کہ جاؤ کہیں اور چلی جاؤ۔ مجھے ان کا آنا بڑا ناگوار گزرا تھا۔ وہ کچھ دیر تو بولتی رہیں پھر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے نا امید ہو کر چلی گئیں۔ میرا بھی موڈ خراب ہو گیا تھا۔

بارش سے پہلے ہی بچے ٹیوشن پڑھنے جا چکے تھے۔ اب میں گھر میں اکیلی تھی۔ ادھر ادھر بیٹھی۔ اخبار اٹھایا بے دلی سے رکھ دیا۔ موڈ بدلنے کو چائے بنائی اور ٹیرس میں آ گئی۔ خلافِ امید بارش تو رک چکی تھی۔ پیڑ پودے دھل چکے تھے۔ فضا بڑی نکھری نکھری تھی مگر اب دل بوجھل ہو چلا تھا۔ بار بار ان دونوں کا چہرہ سامنے آ رہا تھا۔ ایک خیال آ رہا تھا کہ کوئی ضرورت مند دروازے پر آیا اور تم نے اس کی مدد نہیں کی۔ جب اللہ تعالیٰ مجھ سے سوال کریں گے اے میری بندی! میں بارش میں تمھارے گھر آیا تم نے دروازہ نہ کھولا۔ میں کہوں گی آپ تو رب العالمین ہیں۔ کسی کے در پر آنے سے بے نیاز ہیں تو وہ فرمائیں گے میری دو بندیاں آئیں تھیں اگر تم انھیں بلا لیتیں تو مجھ ہی کو پاتیں۔

اف! یہ بارش تو مجھے آزمانے کے لیے برسی تھی۔ شاید میرے دل کو دھونے کے لیے مگر وہ تو ویسا ہی رہ گیا۔ سخت، بنجر، خشک، میلا کچیلا۔ اس شاندار، سلیقے سے چمکتے گھر کے مکین کا دل کتنا سخت، کتنا ویران اور کتنا میلا ہے.....سو اس کی کچھ تلافی کرنی چاہیے۔

صبح جب ماں بیٹی گزریں تو میں نے انھیں بلایا اور دوپہر کو آنے کے لیے کہا۔ پھر میں نے ایک مرغی منگوائی۔ بھرپور سا سالن بنایا اور بازار سے روٹیاں منگائیں کھانا پیک کر کے رکھا اور جب وہ آئیں تو انھیں دیا۔ وہ بے چاریاں اس عنایت پر کل کا سلوک بھول گئیں اور مجھے دعائیں دیتی ہوئی چلی گئیں۔ وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ اب میرا بڑے سے بڑا احسن سلوک بھی اس دن ذرا سی دیر گھر میں بٹھا لینے کے برابر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو میری ایک بھونڈی سی کوشش تھی اپنے دل کی کسک مٹانے کی .....آج بچپن کا شعر مجسم ہو کر سامنے آ گیا تھا۔ دادی اماں آپ صحیح کہتی تھیں ؎

وقت پر کافی ہے قطرہ ابر نیک انجام
کا
جل گئی کھیتی اگر برسا تو پھر کس کام کا

میں نے اپنی کھیتی پیاسی ہی جلا دی اب جو پانی ڈال رہی ہوں تو کیا کوئی دانہ، کوئی خوشہ بچا ہوگا۔ وجود کے اندر سے کہیں اک آواز آئی۔

دل کی کھیتی تو بس آنسوؤں سے سیراب ہوتی ہے۔ اگر تمھارے پاس ایک دل ہے شرمسار اور چشم نم بھی تو پھر تمھارا رب تمھاری طرح کم ظرف نہیں ..... وہ ان آنسوؤں کو قبول کر کے دل کی کھیتی کو پھر سے ہرا بھرا کر دیتا ہے۔ بس دل کا خیال رکھنا۔ بے شک تمھارے رب کا دامن رحمت تو بہت وسیع ہے۔ اس کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔

❁❁❁

اونچے قد کا آدمی

جھن جھن..... جھناک..... ٹرالی پر سے برتن گرے اورٹوٹ گئے۔ فاخرہ نے جلدی سے آ کر دیکھا۔ارسلان ڈرائنگ روم سے ٹرالی گھسیٹ کر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹرالی کا پہیہ قالین میں پھنسا اور ارسلان میاں ٹرالی سمیت فرش پر آ رہے، اس نے ارسلان کو بے تحاشا پیٹ ڈالا اور بولی۔

''میں نے تجھے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ بڑوں والے کام مت کیا کرو.....اور یہ برتن توڑنے والی بے ہودگی تو میں برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ پیشتر اس کے تجھے اس قسم کی کوئی عادت پڑے میں تیرے ہاتھ توڑ دوں گی۔''

اس نے ننھے ارسلان کا کان مروڑ کر نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کا شوہر فیضان بڑے مزے سے صوفے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی ''اگر یہ چاہتے تو بچے کو ٹرالی گھسیٹنے سے منع کر کے نوکر کو آواز دے سکتے تھے یا مجھے بلا سکتے تھے۔ مگر یہ تو مزے سے بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ان کا اپنا ہی مشغلہ ہے..... انہیں کیا جو نیا ٹی سیٹ تباہ ہو گیا یا بچے کو بے بھاؤ کی پڑ گئیں۔''

''یہ توڑ پھوڑ کے جراثیم میں تیرے خون سے نکال دوں گی، سمجھے!'' فاخرہ پھر بیٹے کی طرف متوجہ ہوئی۔

یہ دیکھ کر کہ اس کی تقریر طویل ہو رہی ہے، فیضان بیزاری سے اٹھا، سگریٹ کو راکھ دانی میں بجھایا اور کار کی چابیاں اٹھا کر بے نیازی سے باہر نکل گیا۔ اس کے اس طرح اٹھ کر چلے جانے سے فاخرہ کو طیش آیا مگر اس میں کہاں جرأت تھی کہ پوچھ لیتی کہاں جا رہے ہو؟ وہ کبھی مارے محبت کے پوچھ بیٹھتی تو وہ یوں غرا کر جواب دیتا جیسے پوچھ کر غلطی کی ہو۔ اسے تو اس دن بھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی جب شادی ہوئے تیسرا دن تھا اور فاخرہ نے حسبِ معمول ڈرتے ڈرتے چائے بنا کر اس کے پاس رکھ دی تھی۔ ایک گھونٹ حلق میں اتارتے ہی وہ رات کی ساری باتیں بھول گیا۔

''یہ ناز نخرے یہاں نہیں چلیں گے بیگم صاحبہ۔'' وہ انتہائی خوفناک چہرہ بنا کر بولا۔

''مگر ہوا کیا.....؟''

''ایسی بدمزہ چائے میں نے آج تک نہیں پی۔ کچے پانی میں پتی ملا کر دینا آپ ہی کے خاندان کا دستور ہوگا۔ اب بھول جائیے کہ آپ چیف انجینئر صاحب کی اکلوتی صاحبزادی ہیں اور جہیز میں بہت کچھ لے کر آئی ہیں، یہاں تو گھر کا سارا کام کرنا پڑے گا۔ میں ان مردوں میں سے نہیں جو خالی ڈگریوں سے بہل جاتے

ہیں۔''

وہ جھپاک سے غسل خانے میں گھس گئی۔آنکھوں میں موجزن آنسو وہ اسے دکھانا نہیں چاہتی تھی اور اس صدمے کو چھپانا بھی چاہتی تھی۔اس نے تو کبھی نہیں سنا تھا کہ نئی نویلی دلہنوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں اور دلہن بھی ایسی کہ اگر اس پر نگاہ پڑ جائے تو دل دھڑکنا بھول جائے۔

مگر صحیح معنوں میں گربہ کشتن روز اول تو اس سے دو روز پہلے ہوا تھا جب شب عروسی گزار کر وہ صبح صبح لجاتی شرماتی بستر پر بیٹھی تھی تو اس نے آ کر کہا:

''کس انتظار میں بیٹھی ہو۔یہاں کوئی چائے بنا کر نہیں لائے گا۔نوکر امی کو چھوڑنے گاؤں چلا گیا ہے۔شاید وہ ان کے پاس ہی ٹک جائے، کیونکہ ان کی طبیعت خراب رہتی ہے۔آج سے تم اس گھر کی مالک ہو۔اٹھو ناشتا بناؤ،خود بھی کھاؤ اور مجھے بھی دو..... ہاں ایک بات یاد رکھنا..... میں صبح چھ بجے چائے پینے کا عادی ہوں۔''

وہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی،اتنے میں وہ باہر سے اخبار اٹھالایا اور مزے سے منہ موڑ کر پڑھنے میں مگن ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان سارے کاموں کی عادت رفتہ رفتہ پڑتی ہے پھر فاخرہ کے گھر میں اس کا کوئی بھائی تھا نہ بہن، پاپا کے ایسے کام کون کرتا ہے،اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ جانے ممی کب کر دیتی تھیں یا کروا دیتی تھیں لیکن یہاں بات بات پر سرزنش ہو رہی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ پاپا نے خود ان صاحب کو سرفراز فرمایا تھا۔ان کا خیال تھا کہ ایسے لڑکے مستقبل میں بہت ترقی کرتے ہیں۔ یوں خاندان کے بہت سارے لڑکے ٹھکرا کر انہوں نے فاخرہ کی شادی اپنے ایک جونیئر افسر سے کر دی تھی۔

لیکن یہ جونیئر افسر تو اس کے لئے جابر حکمران بن بیٹھا تھا۔

کبھی کبھی محبت کروانے کو نہیں، کرنے کو جی چاہتا ہے۔کسی کو چاہنے کو.....اپنانے کو.....اپنا تن من اس پر وارنے کو..... اپنی ہستی اس پر نچھاور کرنے کو اور عورت تو ازل سے ہی لٹانے کو، وارنے اور مٹ جانے کو بنی ہے۔

لیکن وہ ظالم اس کی بھی کہاں مہلت دیتا تھا جیسے اسے کچھ لینا ہے اور نہ کچھ دینا۔گھر میں ایک ننھے مہمان کی آمد کے آثار پیدا ہوئے تو فاخرہ کی زندگی پہلے سے بوجھل اور سوگوار ہو گئی۔ایک عجیب سی قنوطیت، سستی او ریاسیت اس کے وجود پر طاری رہتی۔ وہ جانتی تھی ان دنوں میں ایسا ہوتا ہی ہے مگر ایسے ہی وقت دل دہی اور دل داری کے ضرورت پہلے سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔صرف لعل وجواہر ہی سے جی نہیں بہلتا۔بعض اوقات تسلی کے دو میٹھے بول بھی پل صراط پر سے

گزر جانے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔اسے یوں چپکے چپکے روتا دیکھ کر کبھی وہ ذرا رکتا اور پھر کہتا۔

''تم پڑھی لکھی ہو۔سمجھدار ہو، آج کل کتابیں خرید کر پڑھا کرو۔اس سے تمہارا علم بھی وسیع ہوگا اور وقت بھی گزر جائے گا۔اب تم ایک ذمے دار ماں بننے والی ہو۔''

'''ہاں ماں ہمیشہ ذمے دار ہوتی ہے،صابر ہوتی ہے،شاکر ہوتی ہے، درد سے بھری ہوئی اک لے ہوتی ہے۔تم اسے لوری کہہ لو..... مدھ بھرا راگ کہہ لو..... سکھ اور شانتی کی چھایا سمجھ لو کہ وہ ایک خوبصورت پڑاؤ کی امین ہوتی ہے۔'' فاخرہ نے سوچا۔

ارسلان، کنعان اور مینا تینوں اوپر تلے آتے چلے گئے تو آپ ہی آپ اس کی زندگی کا ایک چلن بن گیا۔ لیکن کبھی کبھی تھک ہار کر وہ سوچا کرتی تھی ''افوا! یہ شادی تو محض روٹی کپڑے کے عوض ایک عمر قید ہے۔آج بھی ہمارے ملک کی عورت کے پاس کوئی تحفظ نہیں، ورنہ یہ مرد اچھی خاصی پڑھی لکھی لڑکیوں کو گھروں میں یوں پامال نہ کریں۔تحفظ اگر کوئی ہے تو وہ میکے میں ہے۔ امیر گھرانوں کی لڑکیاں خوب دھونس دھاندلیاں جماتی ہیں، روٹھ روٹھ کر ماں کے گھر جا بیٹھتی ہیں۔امیر باپوں نے وظیفے مقرر کر رکھے ہوتے ہیں تبھی تو داماد ہاتھ باندھے غلام نظر آتے ہیں اور دم دبائے ان کے پیچھے پیچھے پھرتے رہتے ہیں۔''

اور یہاں.....سب کچھ ہونے کے باوجود پاپا نے شادی سے پہلے کس خوبصورتی سے اسے سب کچھ جتا دیا تھا کہ اب وہ جس گھر میں جا رہی ہے وہی اس کا گھر ہے۔

زندگی میں کئی موقعے ایسے آئے جب اس کا بے اختیار دل چاہتا تھا کہ پاپا کے پاس چلی جائے، ممی کی گود میں سما جائے مگر اس نے نہایت کرب سے گزر کر ہمیشہ اپنے جی کو روکا۔اگر پاپا نے دھونس نہ دی ہوتی اور ممی نے کلیجے سے لگا لیا ہوتا تو وہ اس ستم شعار کے پاس واپس آنے کا نام ہی نہ لیتی۔فاخرہ کے والدین کے گھر کسی بھی شے کی کمی نہیں تھی مگر جب بھی پندرہ بیس دن بعد وہ ایک دن کے لیے وہاں جاتی، پاپا اس کی اداس آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش ہی نہ کرتے۔بس اس کی اطلاع پا کر کھڑے کھڑے اندر آ جاتے، اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور کہتے ''اچھی تو ہے ہماری بیٹی۔''

وہ ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیتی جو پاپا کے فیصلے کے بعد خود بخود جھک گیا تھا اور ممی بھی تو جیسے اس کی آنکھوں میں جھانکنا بھول گئی تھیں۔

البتہ بچوں سے دونوں نانا، نانی والہانہ پیار کرتے، بچوں کو بلا کر اپنے پاس رکھتے، دنیا جہان کی چیزیں انہیں خرید کر دیتے۔مگر اس کے لئے کیسے انجان تھے؟

اور پھر والدین کے بعد..... سچے پیار کا منبع وہ شوہر کو سمجھتی تھی۔ اپنی تمام تر صداقت اور عظمت کے باوجود ماں باپ کا رشتہ بیچ راہ میں ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر اٹل اور ہمیشہ رہنے والا رشتہ شوہر کا ہوتا ہے۔ اگر محبت درمیان میں ہو تو یہی رشتہ دنیا کا خوبصورت ترین ناتا بن جاتا ہے۔ قرب ہی اس رشتے کا تقدس ہے۔

مگر یہ کیسا قرب تھا کہ جس میں اسے فاصلے ہی فاصلے نظر آتے تھے۔ وہ اکثر سوچتی کہ فاصلے فیضان کے پیدا کردہ ہیں یا اسکی اختراع.....

سوچ سوچ کر وہ اپنے آپ میں لوٹ آتی تھی۔ ویسے وہ اس کی حکم عدولی کرنا پسند نہیں کرتی تھی نہ اسے خفا کرنے کا اس میں حوصلہ تھا۔ وہ جب آواز دیتا تو یوں جیسے اپنی باندی کو بلا رہا ہو۔

''فاخرہ.....!'' اس کا لہجہ کس قدر کھردرا، سپاٹ اور رعب دار ہوتا۔

کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ اس کے لہجے کو پیار کی شیرینی چھو جائے اور وہ فاخرہ سے فخری بن جائے۔ ننھی سی بچی۔ اس کے بازوؤں میں مچل جانے والی۔ اس کے کاندھے پر سر رکھ کر سو جانے والی..... شادی کے بعد کتنی بے شمار باتوں پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ تبھی گھر کی بڑی بوڑھیاں بات بات پر کہتی ہیں ''اگلے گھر جاؤ گی تو پتہ چلے گا۔''

کیا پتہ چلے گا، اس بات پر وہ اور اس کی سہیلیاں اکثر ٹھٹھے لگایا کرتی تھیں..... چاہنے کو شوہر ہوگا، کھانے کو بہترین کھانا، پہننے کو اعلیٰ ترین کپڑا، اپنا گھر، آزادی اور سب مزے۔

مگر بڑی بوڑھیاں حقیقت میں جوان لڑکیوں کو بددعا دیتی ہیں کیونکہ ان کی اپنی جوانی تو ڈھل چکی ہوتی ہے نا..... کہ ایک پل بھی خوشی کے لئے نہ جیو..... پاجامہ نہ پہنو کہ تمہارے شوہر کو اچھا نہیں لگتا..... خواہ تم اس میں اپسرا لگو۔ جوڑا نہ لگاؤ کہ انہیں مصنوعی لگتا ہے۔ آئی شیڈ نہ استعمال کرو، یہ خالص اداکاراؤں کا فیشن ہے۔ بازو اور پیٹ ننگا نہ کرو کہ انہیں غیرت آتی ہے، دوسرے مرد دیکھ نہ لیں۔ ہاں یہ خود چاہے سارا دن دوسری عورتوں کو نظر بھر بھر کے دیکھتے رہیں۔

''آخر مردوں کو اچھا کیا لگتا ہے؟'' ایک دن وہ جل کر اس سے پوچھ بیٹھی۔

''شریف عورت!''

''میں لباس کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔''

صحیح لباس ہی کو شریف عورت کہتے ہیں۔''

''صحیح لباس کیا ہوتا ہے؟''

''جس میں عورت صرف نظر آئے اشتہار نہ نظر آئے۔''

''یہ جو اتنے بے شمار کپڑے میری امی نے جہیز میں دیے ہیں اور آپ بھی بری میں لائے تھے ان کی کیا

ضرورت تھی؟''

''تسلی کے لئے اپنے پاس رکھو۔''

''صرف تسلی کے لئے۔''

''اچھا پھر دوسری عورتوں کی طرح تم بھی خودنمائی کرواور روز ایک جوڑا پہن کر بازار چلی جایا کرو۔''

''اچھا، جدید لباس پہننا خودنمائی ہے۔''

بالکل..... ورنہ عورت کے لئے تو موزوں لباس وہی ہے جس میں وہ اپنے شوہر کو اچھی لگتی ہے۔''

''اچھی لگے تب نا؟ بات تو اچھی لگنے کی ہے۔''

مگر وہ اس کا جواب ہی نہ دیتا..... رسالہ اٹھا کر منہ دوسری طرف پھیر لیتا۔

اس انداز پر وہ جل جاتی۔

کبھی کبھی جب وہ پرانی سہیلیوں سے ملتی تو پھر اس کے ادھورے سپنے جاگنے لگتے، نہ چاہتے ہوئے بھی، رات کو سوتے وقت وہ ایسی بات کہہ جاتی۔''آپ کو معلوم ہے فریحہ کے میاں کا کراچی تبادلہ ہوگیا ہے۔''

''اچھا..... کب جارہا ہے وہ۔''

''وہ تو کہہ رہا تھا پہلے گھر کا بندوبست ہوگا پھر وہ فریحہ کو ساتھ لے کر جائے گا۔''

''کیوں..... کیا وہ اپاہج ہے۔''

''خدا نہ کرے..... آخر آپ کسی سے اتنا حسد کیوں محسوس کرتے ہیں۔''

''اس میں حسد کی کون سی بات ہے۔تم نے کہا کہ وہ فریحہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا..... میں نے سمجھا ، ہوگی کوئی ایسی ہی مجبوری۔''

''جی ہاں..... اتنے ہی آپ معصوم ہیں۔آپ کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ ایک دوسرے سے اس قدر محبت کرتے ہوں گے۔''

''محبت کرنے کے لئے تو ذرا فاصلے پر رہنا ضروری ہوتا ہے۔''

''محبت کے لیے یا پھر نفرت کے لئے؟''

''دونوں کے لئے.....''

اور اس کی بقیہ رات روتے ہوئے گزر جاتی۔

پھر کسی دن کوئی احساس جاگ اٹھتا تو وہ کہتی۔''آپ کو معلوم ہے فائزہ کا میاں اسے اتنا چاہتا ہے کہ جب صبح دفتر جاتا ہے تو وہاں سے دل کی شکل کے شامی کباب چپراسی کے ہاتھ فائزہ کے لیے بھیجتا ہے۔''

''کیا وہ ہوٹل میں کام کرتا ہے؟''

''مجھے معلوم تھا آپ جل جائیں گے۔''

''بھئی اس میں جلنے والی کون سی بات ہے۔میں کوئی اس کی بیوی کا کرائے کا عاشق تو نہیں ہوں۔اگر وہ ہوٹل میں کام نہیں کرتا تو پھر اتنے اہتمام سے وہ کس سے کباب بنواتا ہے اور اسے گھر بھیجنے کی فرصت کیسے مل جاتی ہے۔''

''مجھے کیا معلوم.....؟''وہ جھلا اٹھتی۔''کسی

ریستوران وغیرہ سے بنوالیتا ہوگا۔''

''مگر کیوں.....کیا اس کی بیوی کھانا نہیں پکا سکتی؟''

''جناب! یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اسے اپنی بیوی سے اتنی محبت ہے کہ دفتر میں بھی برابر اس کا دھیان رہتا ہے۔''

''یا اس احتیاط کی خاطر کہ اس کی بیوی کو معلوم نہ ہوجائے کہ وہ دفتری اوقات میں کیا کرتا رہتا ہے۔''

''اور آپ کو تو جیسے معلوم ہے۔''

'فیضان اتنی زور سے ٹھٹھا لگا کر ہنستا کہ اسے اپنی سبکی محسوس ہونے لگتی۔

''اس میں ہنسنے والی کون سی بات تھی۔''

''یہ بات تم عورتوں کی سمجھ سے بالاتر ہے.....''

اف! اس کا یہ احساس برتری.....جو ہر بار اس کی انا کو پاؤں تلے کچل دیتا تھا۔

''جی ہاں! آپ کے پاس جب دلائل ختم ہوجائیں تو آپ عورت کو ناقص العقل ثابت کرنے ہی پر سارا زور بیان صرف کیا کرتے ہیں۔''

''بھئی اب تمہیں یہ کیسے بتاؤں.....کہ.....ممکن ہے یہ شامی کباب دفتر میں اس کی سہیلی بنا کر لاتی ہو۔''

''کیا سہیلیاں دفتروں میں بھی آیا کرتی ہیں؟''

''جی ہاں.....دفتروں میں بھی آیا کرتی ہیں۔''

''کیا ہر مرد نے دفتر میں سہیلیوں کا بندوبست کیا ہوتا ہے؟''

''اس کے متعلق کیا کہا جاسکتا ہے۔''

وہ منہ پھیر لیتی اور جلنے اور کڑھنے کا دور شروع ہوجاتا۔ کس قدر ظالم اور سفاک تھا یہ شخص، اظہار محبت تو کیا تسلی کے لیے جھوٹ بھی نہیں بول سکتا۔

یہی کہہ دیتا کہ بھئی ہر آدمی کی سہیلی نہیں ہوتی تو اس کا کیا جاتا۔ مگر وہ بیوی کو کیا سمجھتا تھا.....کہاں ہیں محبت کے وہ گوناں گوں اظہار جو شوہر وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔

''اف اللہ.....'' وہ سوچتی یہ بھی کس قدر عجیب تعلق ہوتا ہے کہ ہزار نفرتوں اور ناچاقیوں کے باوجود شوہر اور بیوی کا رشتہ اپنی جگہ ویسے کا ویسا رہتا ہے۔ نہایت سنگین لڑائی ہوچکی ہو.....کیسی بھی قسمیں کھائی جا چکی ہوں.....ایک دوسرے کی صورت نہ دیکھنے کا عہد کرلیا ہو تو پھر بھی اندر ہی اندر ایک انجانا سا.....غیر محسوس سا.....مگر مضبوط تعلق اپنی جگہ برقرار رہتا ہے.....کہیں بھی چلے جاؤ شمع کے مانند یہ تعلق روشن رہتا ہے.....منہ موڑ لو تو بھی روشنی کی لکیر کہیں نہ کہیں سے در آتی ہے۔ بے نیاز بننے کی کوشش کرو تو بھی بنا نہیں جاتا.....اس تعلق کو سمجھ بوجھ کر توڑنا چاہو تو کبھی بچے راہ میں آجاتے ہیں اور کبھی وہ میٹھا درد جو ایک دوسرے کے نام سے دل کے نہاں خانے میں ہوتا رہتا ہے۔

لیکن آج کا غصہ کسی اور نوعیت کا تھا۔ یوں تو عرصہ ہوا وہ اس کی کج ادائیوں کی عادی ہو چکی تھی، اپنے حالات میں ڈھل گئی تھی.....اور اس کی خوشنودی کو اللہ کی رضا اور اپنا ایمان سمجھ بیٹھی تھی پھر بھی کبھی کبھی ایسی بات ہو جاتی کہ نئے سرے سے اپنا تن من جلانے کا جواز مل جاتا۔

صبح دفتر جاتے ہوئے فیضان نے کہا تھا ''کراچی سے میرا دوست نواز آ رہا ہے۔ میرا بہت پرانا دوست ہے۔ شادی کے وقت باہر گیا ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ یہاں آ رہا ہے اور آ کر ہمارے گھر ٹھہرے گا۔''

''سن رہی ہو نا؟ پہلی مرتبہ آ رہا ہے اور.....''

''ہاں مجھے معلوم ہے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یہی نا کہ آپ کے دوست بہت لاڈلے اور دلارے ہیں، بیوی بچوں سے پیارے ہیں، مجھے اس کے ناز نخرے اٹھانے ہوں گے اور ہر طرح کا خیال رکھنا ہوگا۔ کوئی تکلیف نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ پہلے بھی بہت دفعہ لیکچر سن چکی ہوں۔'' وہ طنز سے بولی۔

''بس یہی عورتوں میں خامی ہوتی ہے۔ خود ہی نتیجہ اخذ کر لیتی ہیں پھر کہتی ہیں کہ ہماری عقل پر بھروسا نہیں کیا جاتا۔''

''تو فرمایئے۔''

''میں کہہ رہا ہوں میرا یہ دوست ذرا اور طرح کا ہے۔ ویسے ادھر ہی رہے گا۔''

''جی.....؟''

اس نے جب حیران سی نظر اٹھائی تو وہ جا چکا تھا۔ یہ اور طرح کا کیا ہوتا ہے۔ کافی سوچنے کے بعد اسے غصہ آنے لگا اور اگر یہ اور طرح کا ہے تو اسے گھر میں رکھنے کا فائدہ؟

لیکن فیضان نے کب اس کے بگڑے ہوئے موڈ کی پروا کی.....گاڑی لے کر جو باہر گیا تو کوئی رات کے گیارہ بجے واپس آیا، اس وقت اس کا دوست نواز ساتھ تھا۔

مہمان خانہ اس نے ٹھیک کر دیا تھا، وہیں پر ان کا کھانا بھجوا دیا اور خود منہ لپیٹ کر سو رہی۔ فیضان کب آیا اور کب سویا اسے علم ہی نہیں۔

دوسرے دن اس نے کہا۔ ''میرا پلنگ بھی نواز کے کمرے میں بھجوا دو۔''

یہ بہت بڑا تازیانہ تھا اس کے لئے، کوئی آدمی اپنے دوست کو اس حد تک اہمیت دیتا ہے؟ فاخرہ برداشت نہ کر سکی۔

رات کے بارہ بجے ہوں گے، بچے سو چکے تھے۔ باہر کی سب بتیاں گل تھیں۔ وہ دونوں کھانا کھانے کے بعد گپ شپ لگا رہے تھے کہ فاخرہ سے رہا نہ گیا، چوروں کے مانند ننگے پاؤں آہستہ آہستہ ایڑیاں اٹھا کر چلتی ہوئی دروازے کے باہر جا کر کھڑی ہو گئی۔

باتوں کی آواز صاف آ رہی تھی۔

''یار ایک ہفتے سے مجھے بور کر رہے ہو۔ میں تو چھٹی لے کر ذرا تازہ دم ہونے کو یہاں آیا تھا۔'' نواز کہہ رہا تھا۔

''میں نے سارا بندوبست کرلیا ہے۔آج رات ہوٹل میں دو کمرے بک ہیں ایک تمہارے لیے اور.....''

''زیادہ تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں نواز۔ میں جب نہیں کہتا ہوں تو اس کا مطلب نہیں ہوتا ہے۔تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' فیضان نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

''عجیب بے وقوف اور دبو قسم کے آدمی ہو۔اب ایسے ہی ان بے وقوف گھریلو عورتوں سے ڈرتے رہے تو زندگی کے چار دن بھاڑ میں چلے جائیں گے..... یہ چار دن جو جوانی کے ہیں۔''

''چھوڑو اس بے ہودہ فلسفے کو، جب ہم ان عورتوں کو گھر کی سب آسائشیں اور آرام دیتے ہیں تو انہیں ہماری نجی زندگی میں دخل اندازی کا حق نہیں پہنچتا۔''

''آرام اور آسائشیں ثانوی باتیں ہیں اور میاں بیوی کی محبت ایک الگ شے ہے۔''

''اوہو تو تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ تمہیں اپنی بیوی سے محبت ہے۔ بھئی محبت کسے نہیں ہوتی اپنی بیوی سے..... تھوڑی بہت مجھے بھی ہے.....مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے دوسرے حقوق سے دستبردار ہو جائیں۔''

''محبت کا ایک اصول بھی ہوتا ہے۔محبت کی ایک تقدیس بھی ہوتی ہے اور میں اپنی بیوی کا بہت احترام کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں وہ میرے لیے کیا ہے مگر کبھی اسے کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔''

''بھئی اسے تو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ میرا ذمہ لے لو.....'' نواز بولا۔''یہ کیا کہ زندگی ایک ہی خاتون سے آگے نہ بڑھے.....کیا جوانی میں پیغمبر بننے والا ہے۔''

فیضان ایک دم کھڑا ہو گیا۔اس نے ایک زوردار جمائی لی اور بولا۔

''بھائی تم جا سکتے ہو۔ شاید میں تمہیں قائل نہ کرسکوں، شادی میں جب محبت شامل ہو جاتی ہے تو اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔ پھر اس خاموش بندھن کو داغدار نہیں کیا جا سکتا۔اپنے اپنے احساس کی بات ہے، یہ کسبیاں تو سبھی ایک سی ہوتی ہیں، البتہ محبوبہ کی صورت ذرا مختلف نظر آتی ہے۔تمہیں یہ باتیں سمجھ میں نہیں آئیں گی۔اور ہاں وہ جو پیسے تم ادا کر چکے ہو مجھ سے لے جاؤ، میں ایک دوست کو زیر بار نہیں کرنا چاہتا۔''

نواز نے آگے کیا کہا.....فاخرہ نے کچھ نہیں سنا، وہ تو سرپٹ اپنے بیڈ روم کی طرف بھاگ گئی۔ تینوں بچے سو رہے تھے، بتی جلا کر وہ انہیں پریشان نہیں کرنا

چاہتی تھی۔ یونہی گھبرائی ہوئی ملحقہ کمرے میں گھس گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے بتی جلائی..... جھن..... جھن..... جھناک..... اس کے وسوسوں کے سارے خیالی بت اوندھے منہ گر گئے۔ اس کے تن من میں بھونچال سا آ گیا۔

اوراس کے ساتھ آنسوؤں کی طغیانی آ گئی۔

اتنی بڑی بات کو برداشت کرنے کے لئے بہت حوصلے کی ضرورت تھی۔ اوراس خوشی کے سنبھالنے کے لئے بہت بڑا دل چاہیے تھا۔

وہ دیوانہ وار قہقہے لگائے یا پھوٹ پھوٹ کر روئے وہ فیصلہ نہیں کر سکی مگر امنڈ کر آنے والے آنسوؤں کو اس نے دعا کے مانند اپنی دونوں ہتھیلیوں پر تھام لیا۔

تھوڑی دیر بعد فیضان اس کو ڈھونڈتا ہوا ملحقہ کمرے میں آ گیا..... ''فاخرہ..... کیا کر رہی ہو یہاں؟'' وہ عین اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

فاخرہ کچھ نہیں بولی، اس کے چہرے پر آنسو ہی آنسو تھے حتیٰ کہ آنسوؤں کی نمکین لکیروں نے اس کے ہونٹ سی رکھے تھے۔

وہ پیچھے کھڑا تھا، یوں وہ پہلے بھی اس سے زیادہ قریب ہوا کرتا تھا مگر آج فاخرہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دلہن بن کر پہلی بار اس گھر آئی ہے، دل کچھ ویسے ہی انداز میں دھڑک رہا تھا..... زبان کچھ ویسے ہی انداز میں گنگ تھی..... سارے جسم پر کچھ ویسا ہی ہیجان اور کپکپی طاری تھی..... اور اس کی شخصیت کا دھیما سینک اس کے روئیں روئیں کو حدت بخش رہا تھا۔

''فاخرہ.....'' اس نے اپنے پرانے انداز میں پکارا۔ اس کی آواز ویسی ہی تھی جیسے وہ شروع دن سے بلا رہا تھا..... غرور، غصہ، رعب، حکمرانی مگر آج اسے اس آواز میں پیار کی مٹھاس بھی محسوس ہوئی۔

یہ جان کر کہ وہ کسی بات پر رو رہی ہے، فیضان نے آہستہ سے اس کی گردن کو چھوا..... ان گنت جگنو جیسے اس کے انگ انگ میں جل اٹھے، تین بچوں کی ماں اس لمس کی تاب نہ لا سکی۔ وہ تڑپ کر مڑی..... اس نے اپنی آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے لمحہ بھر کو فیضان کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ اسے اتنا ہی اونچا..... اتنا مقدس..... اتنا عظیم دکھائی دیا اور اپنا آپ اتنا بونا، چھوٹا اور حقیر۔

☆☆☆

وہ ایک انداز تیرا

کلون میں ان دنوں فجر تقریباً ساڑھے چار پر ہورہی تھی۔ جب کہ یونیورسٹی ٹائم اس کا آٹھ بجے کا تھا۔ وہ سات بجے گھر سے نکل جاتی تھی۔ خاصی لمبی پیدل مسافت کے بعد اسے ٹرین لے کر یونیورسٹی پہنچ جانا تھا۔ یہاں لوگ خوب پیدل چلتے تھے۔ اسّی برس کی عمر میں بھی خوش باش اور چاق و چوبند۔ اچھے حالات اور نظام زندگی کے علاوہ ان کی صحت کا راز انکے طرز زندگی پر تھا۔ محنت اور سادہ غذا عمومی طور پر ان کو بہت سے امراض سے دور رکھتی تھی۔

طلعت علی بھی جس وقت گھر سے نکلی تو سیل فون پر ماریو کی بائیس مسڈ کالز تھیں اور درجن بھر میسج۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر سارے میسجز کو یکے بعد دیگرے بنا پڑھے مٹا دیا۔ دل بوجھل سا ہونے لگا تھا۔ کلون چھوڑنے کا فیصلہ اس کے دل میں ایسی خراشیں ڈالنے لگا جیسے پچھلے ماہ ہی اس نے پرکار کی نوک کا استعمال کرتے ہوئے ماریو کے لئے سالگرہ کا رڈ پر تجریدی نمونہ بنایا تھا۔ بڑے اہتمام سے اس نے پنسل کلرز استعمال کر کے اس پر کالا رنگ پھیرا تھا۔ دھنک کے سات رنگوں پر جیسے ایکدم سیاہ چادر تن گئی تھی۔ پھر پوری رات اس نے اسے خشک کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ ایک، دوگھنٹہ میں بھی وہ خشک ہوسکتا تھا اور ڈرائیر سے لمحوں میں، لیکن وہ ماریو کو دی جانے والی چیز میں وقت بھی خوب خرچ کرنا چاہ رہی تھی۔ پھر صبح پر کار کی کونوک کو چابکدستی اور مہارت سے استعمال کرتے ہوئے اس نے تجریدی آرٹ کا دلکش ڈیزائن بنا کر اس پر فار ماریو اور فرام اَت لکھا تھا۔ اس وقت وہی پرکار کی نوک اسے اپنے دل پر آنسو کندہ کرتی محسوس ہورہی تھی۔

وہ دو قدم ہی چلی تھی کہ کسی نے اس کے بازو کو ہلایا وہ چونک گئی، سامنے ماریو کھڑا تھا۔ پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ طلعت کے دل کی دھڑکنیں جیسے تھم سی گئی ہوں۔ وہ سکتے کے سے عالم میں اس کو دیکھے جارہی تھی۔ ''یے اَت! ڈیر!'' ماریو کے لب ہلے تو وہ بے اختیار مڑ کر گھر کی جانب چل پڑی۔

''اَت! کیا ہوا ہے تمہیں۔ کیوں ایسا کر رہی ہو میرے ساتھ۔'' اس کے الفاظ نے طلعت علی کے بڑھتے قدم روک دیئے، ماریو تیزی سے سامنے آ گیا۔ ''ٹھیک ہے اَت تمہیں اپنا دین پسند ہے اور مجھے تم، سو میں تمہاری خاطر تمہارا دین اپنانے کو تیار ہوں، تم کہیں نہیں جاؤ، اَت! یہیں رکو، کلون میں میرے

پاس، میرے ساتھ۔'' ماریو نے اس سے پہلے اتنے جذباتی جملے کبھی نہ بولے تھے۔اس نے طلعت علی کے ہاتھ کو تھامنا چاہا۔وہ سرعت سے پیچھے ہوگئی۔

''نہیں ماریو مجھے آزماؤ نہیں، میری خاطر دین قبول کروگے تو وہ تمہیں طوق لگنے لگے گا۔اس کے احکامات تمہیں جبر اور زیادتی لگیں گے۔ پھر آگے کی نسل بھی اسی طرح کنفیوژڈ ہوگی جیسے تم دو مختلف دین کے ماں باپ کے ساتھ بن گئے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے طلعت علی کی آواز بھرا چکی تھی اور ماریو گم سم اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

اس نے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا جو میرون وولن سکارف کے ساتھ سیاہ لیدر جیکٹ میں تھی اور دھڑکنوں میں بس چکی تھی۔ اس کی سبزے نما آنکھیں متورم سی تھیں۔شاید وہ بہت روئی تھی۔وہ اس کی خاطر شہر کے باہر سے بھاگا چلا آیا تھا۔کسی کام سے اسے گزشتہ رات کلون سے باہر جا کر دو دن گزارنے تھے۔لیکن اسکی کال اور پھر اس کے رونے کی آواز نے ماریو کی تمام تر ترتیب بدل ڈالی تھی اور وہ اسی لمحے ٹرین پکڑنے کے لئے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔اب جب وہ اسے ملی تو اس سے یہ کہہ رہی تھی کہ وہ اس کو چھوڑ دے، ''یہ کیسے ممکن ہے ات۔'' وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔

مگر طلعت علی وہاں کب تھی وہ تو اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہوچکی تھی۔ وہ جس وقت گھر میں داخل ہوئی عثمان ملک کھڑکی سے باہر جھانک رہے تھے۔طلعت نے دل میں خاصی خفت محسوس کی۔اس کھڑکی سے گھر سے باہر کا منظر واضح نظر آتا تھا۔

''ماریو کو اندر بلا کر لاؤ طلعت۔'' انہوں نے محض یہ جملہ کہا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔طلعت علی نے استعجابیہ نظروں سے ماموں کو دیکھا جہاں ہمیشہ جیسی نرمی پھیلی تھی۔ بنا کچھ کہے وہ باہر کی طرف بڑھ گئی۔ ماریو بدستور اسی جگہ تھا۔بس فرق یہ تھا کہ اب وہ نزدیکی بنچ پر بیٹھا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔کون کہہ سکتا تھا کہ یہ نیوکلیر سائنس کا بہترین دماغ ہے۔''ماریو آؤ میرے ساتھ، میرے گھر آؤ۔'' اس نے گردن موڑ کر اپنے گھر کو دیکھتے ہوئے ماریو کو پکارا تو وہ چونک گیا۔آج سے پہلے کبھی ات نے اسے اپنے گھر نہیں بلایا تھا۔وہ جس وقت طلعت کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوا۔ طلعت علی نے اپنے سر کے اوپر پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ واضح طور پر سنی۔ ماریو اور عثمان ملک بھی چونک کر اسی رخ پر دیکھ رہے تھے جہاں طلعت علی کی نظریں تھیں۔''یہ امرتا ہے!'' طلعت نے ایک گہری سانس لے کر جیسے دونوں کو اطلاع دی تو انہوں نے کچھ تاثر ظاہر نہیں کیا۔عثمان ملک اور ماریو آمنے سامنے صوفوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ ماریو کی نظریں گاہے بہ

گا ہے طلعت کی جانب اٹھتیں، چاہت کے رنگ اس کی نگاہوں میں نمایاں تھے۔ عثمان ملک نے اپنے ساتھ بیٹھی طلعت کو دیکھا جس کے چہرے پر فیصلہ کر لینے والا تاثر ٹھہرا تھا لیکن جذبوں کو روندنے کے دکھ نے خراشیں سی ڈال رکھی تھیں۔ انہوں نے دکھ کو دل سے لپٹا محسوس کیا اور ماریو کی جانب متوجہ ہو گئے۔ ''ہاں تو جوان تمہیں میری طلعت پسند ہے؟ اور تم اس کے لیے کسی بھی راہ پر اس کے ساتھ چل سکتے ہو؟ کیا تمہیں پتہ ہے اس کی منگنی ہو چکی ہے اپنے کزن سے، اور بہت جلد یہ جرمنی سے جانے والی ہے۔'' عثمان ملک بنا کسی تمہید کے ماریو سے سوالیہ اور اطلاعیہ دونوں انداز اختیار کرتے ہوئے مخاطب ہوئے تھے تو اس نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ عثمان ملک کو دیکھا۔ ''درست ہے کہ مجھے اَت پسند ہے۔ میں ہر اس راہ پر چلنا پسند کروں گا جہاں مجھے یہ مل سکتی ہے۔'' اتنا کہہ کر ماریو نے طلعت پر نگاہ ڈالی، ان دیکھی لہریں طلعت کو اپنے دل سے ٹکراتی محسوس ہونے لگیں۔ اگلے ہی لمحے ماریو عثمان ملک کی جانب رخ کر چکا تھا۔ ''مجھے یہ بھی علم ہے کہ اَت کی منگنی اپنے کزن عباس محمود سے ہو چکی ہے۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ اگر عباس محمود کو اَت نہ ملی تو اَت جیسی اور اس کو مل جائیگی لیکن کلون میں رہتے مجھے یعنی ماریو یا اگر آپ مجھے میرے والد کے رکھے نام سے پکاریں تو فاروق علیم کو اَت جیسی ملنی محال ہے۔ اس کے ساتھ رہ کر میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ خلا جو میرے اندر بچپن سے دو مختلف مذاہب کے والدین کے ساتھ رہ کر پلا ہے وہ بھر رہا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اَت کے بنا کہے بھی اَت کا دین کچھ عرصہ میں خود ہی اپنا لیتا کیونکہ یہ اور میری ماں کا مذہب ایک ہی روشنی کے دو مختلف دائرے ہیں۔ بس آج تک میں یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ مجھے کس دائرے میں کھڑا ہو جانا چاہیے لیکن اَت کے ساتھ گزارے وقت نے یہ فیصلہ آسان کروا دیا تھا۔'' ماریو کی آواز بتدریج دھیمی ہو گئی تھی۔ اب وہ کسی کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ لمحہ بھر قبل طلعت علی نے بھاپ اڑاتی کافی کے مگ عثمان ملک اور ماریو کے آگے رکھے تھے، خود وہ اپنے دونوں ہاتھ کافی کے مگ کے گرد لپیٹے کافی کی سطح پر بنتے جھاگ کا بظاہر معائنہ کرتی نظر آ رہی تھی۔ ماریو کی نگاہ دیوار پر آویزاں فریم پر تھی جس پر کلمہ طیبہ جرمن زبان کے ترجمے کے ساتھ عثمان ملک کی جرمن بیوی نے نہایت خوبصورتی سے پینٹ کیا تھا۔ وہ ایک بہترین آرٹسٹ تھیں۔ عثمان ملک کے گھر میں جا بجا ان کے بنائے شہ پارے موجود تھے۔ جس وقت عثمان ملک سے شادی ہوئی تھی وہ کلون کی بہترین مجسمہ ساز مانی جاتی تھیں۔ لیکن اسلام میں آتے ہی اپنے کیریر کے عروج کو انہوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور ساری توجہ محض رنگوں کے استعمال تک محدود کر دی۔ اس میں بھی وہ جاندار قدرتی نباتاتی مناظر کے علاوہ کچھ بھی

پینٹ کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ ''اللہ بہت بڑا آرٹسٹ ہے، ہم اس کے آرٹ کی بس اس حد تک تصویر بنا سکتے ہیں جہاں تک اپنے کام کی کاپی کی وہ اجازت دے۔ تمام جملہ حقوق محفوظ ہیں Patent کا اصول اس نے بھی رکھا ہے۔'' وہ ماریہ تھیں اور ماریہ ہی رہیں، ان کا یہ جواب عموماً اس سوال کے جواب میں ہوتا کہ اتنا شاندار کیریر انہوں نے کیوں چھوڑ دیا۔ کیا ان کا نیا مذہب اتنا تنگ نظر اور تنگ دامن ہے کہ ایک صلاحیت کو پنپنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ اب اس وقت ماریو کی نظریں ان مقدس اور دنیا کی عظیم ترین سچائی پر جمی ہوئی تھیں۔ کونے میں ماریہ عثمان لکھا بخوبی نظر آتا تھا۔

''ماریہ عثمان!'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ عثمان ملک نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں فریم کو دیکھا۔

''ہاں یہ میری بیوی نے بنائی ہے۔'' ان کے لہجے میں ماریہ کے لیے واضح احترام تھا۔ وہ واقعی ایک محبت کرنے اور خیال رکھنے والی عورت ہیں۔

ان کی بات سن کر ماریو کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ''آپ کو پتہ ہے ماریہ میری کون ہیں؟'' ماریو کے سوال پر طلعت نے الجھ کر اسکو دیکھا اور عثمان ملک کے جواب نے اس کو ششدر کر دیا۔

''ہاں معلوم ہے ماریہ تمہاری ماں کی چھوٹی بہن ہے۔'' جب ہماری شادی ہوئی تھی تو تم محض دو سال کے تھے، تمہاری والدہ ماریہ سے سارے تعلق اس لیے توڑ گئی تھیں کہ انہوں نے اسلام کو چن لیا تھا۔ ان کو ہماری شادی پر اعتراض نہ تھا لیکن ماریہ کے مذہبی انتخاب پر سخت ناراضگی تھی۔ ماریہ نے بھی خوب وفاداری اپنے فیصلے کے ساتھ نبھائی اور ہر رشتہ سے کٹ کر خدا کے حقیقی راستہ پر چلنا پسند کیا لیکن سب بہن بھائیوں کی لاڈلی بہن اور ماں باپ کی لاڈلی بیٹی کو رشتوں سے دوری اندر ہی اندر گھلاتی جا رہی ہے۔ اس نے بہت کوشش کی تم سب سے جڑنے کی لیکن سب نے ہی اس کو گلے سڑے پھل کی مانند اپنی زندگی سے جدا کر دیا ہے۔''

عثمان ملک کے الفاظ ماریو سے زیادہ طلعت کے لئے انکشافات تھے۔ اس نے تو بس یہ ہی جانا تھا کہ ماریہ عثمان ملک کا کوئی حقیقی رشتہ موجود نہیں اور مذہبی تہذیب میں یہ ایسے عموماً ہی ہوتے ہیں، اس نے کبھی تعجب یا کھوجنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی، لیکن اب ماموں کے یہ جملے اس کو جیسے گم صم سا کر چکے تھے۔ ''ماریہ، ماریو'' یہ دو نام اور ان کا تعلق اس کو ایک نئی جذباتی کیفیت سے گزار رہا تھا۔

''اس کا مطلب ہے آپ جانتے تھے مدت سے؟''

''نہیں میں تمہیں مدت سے نہیں جانتا تھا بس محض اتنے وقت سے جب سے طلعت سے تمہاری

جان پہچان ہوئی تھی، ہم لوگ اپنی بیٹیوں کی طرف سے کبھی آنکھیں بند نہیں کرتے۔ ان کی حفاظت کی ہر وقت ہمیں پروا رہتی ہے۔'' عثمان ملک نے ماریو کے سوال پر جس انداز میں جواب دیا اس میں ایک سرپرست کی سی ذمہ داری اور باپ کی سی فکر نمایاں تھی۔طلعت علی نے اپنے رگ و پے میں لہر سی دوڑتی محسوس کی۔

ماریو نے کافی مگ کو ابھی تک ہاتھ بھی نہ لگایا تھا، اس کے چہرے پر سوچوں نے جال سا بن دیا تھا۔ وہ آج سے پہلے یہ بات نہ جانتا تھا کہ جس ماریہ عثمان ملک کا ذکر اسکی ماں نے برسوں قبل کلون کے گلاس ٹاور میں لگے مجسمہ کو دیکھ کر کیا تھا، وہ اَت کی مامی ہیں۔اس کی ماں اس مجسمہ کے پاس کافی دیر تک کھڑی رہی تھیں۔ وہ پہلی اور آخری بار تھی جب انہوں نے اپنی بہن ماریہ کا ذکر بہترین مجسمہ ساز کے طور پر کرتے یہ بتایا تھا کہ اس نے اپنے شوہر کے جبر پر اس کا مذہب قبول کرتے ہوئے اپنے کیریر کو قربان کر دیا تھا۔اسلام ایک تنگ نظر مذہب ہے، آرٹ اور کلچر کا دشمن، بے حد تنفر سے کہتے ہوئے انہوں نے بات ختم کر دی تھی۔ اس کے بعد اور اس سے پہلے ماریو نے اپنی خالہ کا ذکر فیملی پارٹیز میں بھی نہ سنا تھا۔لوگوں نے واقعی انہیں کسی تعفن زدہ کی طرح مسترد کر دیا تھا۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ اس کی کسی خالہ کو کسی عثمان ملک نام کے مسلمان نے جبراً مسلمان بنا کر اس کو بے حد محدود زندگی میں قید کر دیا تھا۔اس کو جتنا بتایا گیا تھا اس کی سچائی یا تفصیل جاننے کی ضرورت اس نے کبھی محسوس بھی نہ کی تھی۔ان کی زندگی بھی اتنی بھرپور رعنائیوں اور دلچسپیوں کے ساتھ تھی کہ یہ سب کھوج بیکار ہی تھی۔بس ایک روحانی اضطراب جو وہ محسوس کرتا تھا، اس کا جواب اسے بے شک نہ ملتا تھا۔ نہ ماں کے فلسفۂ زندگی سے اور نہ باپ کے طرز حیات سے.....اس اضطراب کی لہر کو بھی جوان عمر کی دلچسپیاں اپنے اندر جلد ہی گم کر دیتیں۔ ایسا صرف ماریو کے ساتھ نہ تھا، اس کے بہت سے دوستوں کے ایسے احساسات تھے لیکن کوئی تسلی بخش جواب روح کی اس پکار کا ان کو نہ ملتا تھا۔

طلعت علی کی جانب بھی وہ اس لیے کھنچتا چلا گیا کہ اس نے اس کے انداز میں کہیں اسی وقار کی رمق سی کی تھی جو ریسرچ کے دوران ایٹم کے ذرات کی گردش میں اس کے مشاہدے میں آیا تھا۔ایسا اسے کسی اور کے ساتھ رہ کر نہ لگا تھا۔اس نے سوچا تھا کہ طلعت علی کے اور ایٹم کے انداز میں کسی درجے کی مماثلت حیرت انگیز ہے۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا طریقہ زندگی ہی فطری نظام کے لیے کامیاب ہے۔ وہ جتنا طلعت کے نزدیک آتا جا رہا تھا اتنا ہی اسے اسلام سے متعلق بنائے گئے تبصروں پر حیرت ہوتی جا رہی تھی۔ یہ تو بے حد نرم ملائم احساسات والا دین ہے۔ وہ بے اختیار

سوچتا اپنی زندگی طلعت علی کے ساتھ گزارنے کے ارادے بناتا چلا گیا۔طلعت اس کو اپنی محسن لگتی تھی۔اس میں دلربائی بھی تھی اور وقار بھی تھا، ان سب سے زیادہ جو اس کے اردگرد کی لڑکیاں تھیں اسکی طلعت علی سے قبل کسی بھی مسلمان سے دوستی نہ ہوئی تھی۔حقیقتاً اس کی پڑھائی اور کھیلوں کی دوسری سرگرمیاں اس کو اتنا متحرک رکھتی تھیں کہ اس نے آگے بڑھ کر کسی سے دوستی نہ کی تھی۔خود بہ خود جن سے ہوگئی بس وہی اس کے دوست تھے۔اسپورٹس کلب میں ترک لڑکے لڑکیاں اس کو ملتے تھے، ان سے آشنائی ہائے، ہیلو یا پھر ہائے بائے تک محدود تھی۔طلعت علی پہلی مسلم فرد تھی جس سے ماریو کی دوستی ہوئی تھی، ایسی جس نے زندگی کے بارے میں اس کے نظریات پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا۔ وہ ماریو کے گلے نہ لگتی تھی، جڑ کر نہ بیٹھتی تھی، وائن نہ پیتی اور پورک نہ کھاتی تھی، ڈانس پارٹیز میں شریک نہ ہوتی۔

امرتا خاصی مشکل سے یہ سب برداشت کرتی، وہ ایسے خاندان سے تعلق رکھتی تھی جہاں سفلی علوم نسل در نسل منتقل کیے جاتے تھے،اس کی فیملی کے ہر فرد کو کسی نہ کسی درجہ پر ان شیطانی قوتوں کو استعمال کرنے کا گر آتا تھا۔ امرتا اپنی عمر کی نسل میں ایک بہترین سائنسی دماغ رکھنے کے ساتھ منفی کمالات میں بھی خاصی زور آور تھی۔اس کی حکومت نے اسے اسکالرشپ پر جرمنی اس لیے بھیجا تھا کہ وہ اپنی دونوں قسم کی قوتوں کو کام میں لے کر اگنی اور ترشول کا بول بالا کر سکے۔ ماریو میں امرتا کی دلچسپی محض دل کی لگی نہ تھی بلکہ وہ یہ بات جان چکی تھی کہ ماریو مستقبل میں اس کی ریاست کے جارحانہ عزائم پورے کرنے کے لیے ایک بہترین چناؤ ثابت ہوگا۔اس کے لیے اسے ماریو کے دل و دماغ پر اس طرح تسلط حاصل کرنا ہوگا جس سے اس کی سائنسی قوتیں کسی بھی طرح نقصان سے محفوظ رہتے ہوئے اس کے قبضہ میں آجائیں۔

طلعت علی کی ماریو سے ملاقات سے قبل سب کچھ امرتا کے طے شدہ منصوبہ کے حساب سے ٹھیک چل رہا تھا۔ ماریو طلعت علی سے کیا ملا، روشنی کی لہریں اس کے اندر طاقتور ہوتی چلی گئیں۔طلعت علی کی بسم اللہ گاہے بہ گاہے کہنے کی عادت ماریو پر اثر انداز ہوگئی اور وہ بھی بسم اللہ کا استعمال کرنے لگا۔اللہ کا نام اس کے لئے کوئی نامانوس تو پہلے بھی نہیں تھا لیکن بہرحال خود اس نے کبھی اپنے رب کو نہ پکارا تھا۔بسم اللہ کہتے وہ اپنے آپ کو بہت آرام دہ کیفیت میں محسوس کرتا تھا۔ یہ نام فطرت کی پکار ہے اس لیے اس سے وابستگی ماریو کے لئے کوئی مسئلہ بھی نہ بنی، ہاں اس نے کوشش کی کہ وہ اَت کے سامنے اسے یہ نہ کہے، اسے عجیب سا لگتا تھا نہ جانے وہ کیا سوچے گی۔حالانکہ یہ بیکار ہی کی ہچکچاہٹ تھی۔مگر طلعت کو کبھی اندازہ بھی نہ ہوا کہ اس کی کون

کون سی عادتیں ماریو پر اثر انداز ہو چکی ہیں۔ وہ طلعت کے ذریعہ تبدیلی اور استحکام کے عمل سے گزر رہا تھا، جبکہ طلعت خود جذباتی دباؤ کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے رگ وریشہ میں اتری تربیت اس کو شتر بے مہار اس طرح نہ کر رہی تھی کہ وہ ہر حدود پھلانگ کر ماریو کو ہر چیز پر مقدم کر دے۔ لیکن ماریو کے بغیر زندگی میں خزاں کا سا موسم چھایا لگنے لگتا تھا۔ جہاں خشک اور زرد پتے ہواؤں کے رحم وکرم پر اپنے مسکن سے جدا ادھر ادھر ڈولتے پھر رہے ہوں۔

اسے اپنے جرمنی آنے کے فیصلہ پر افسوس ہونے لگا تھا۔ پتہ نہیں جرمنی، کلون میں دو سال کے لئے رکنا غلط تھا، یا سائیکل ریس میں شرکت غیر مناسب تھی، یا ماریو کے ساتھ بات چیت کا آغاز، اصلی غلطی کیا تھی۔ وہ تلاش کرنے لگی تھی۔ ماریو سے پہلے اسے کسی مرد سے بات چیت کو غیر رسمی نہ ہونے دیا تھا۔ اس لیے نہ اس وقت تک عباس محمود کا چہرہ دھندلایا تھا اور نہ دل میں کوئی آنسو گرے تھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ کلون میں رکنے کی خواہش ابھرتی اگر تھی بھی تو عباس محمود سے شادی کے بعد کا نقشہ ذہن میں ترتیب پاتا تھا۔ بس تعلق کی وجہ بدلنے کی دیر تھی اور ساری سیٹنگ اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ زندگی کا ہر دائرہ دوسرے سے تصادم کی کیفیت میں آ چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ طلعت علی کی زندگی میں گھومتے رشتوں کے سیارے اپنے اپنے مدار سے ہٹ کر بھونچال پیدا کر چکے ہوں اور ان سب کا نقطہ آغاز وہ لمحہ تھا جب اس نے روشن ہدایتوں کے برخلاف نفس کی پکار پر نگاہیں اور جذبے آزاد کئے تھے۔ وہ اس وقت بھی ماریو اور عثمان ملک کے چہرے پر گاہے بہ گاہے نظر ڈالتی اپنی دو سال قبل اور اس لمحہ کی کیفیت کا تجزیہ کرنے لگی تھی۔ کافی کے مگ کی سطح تک آتے جھاگ کا ساتھ ختم ہو چکا تھا۔ وہ خواہش کر رہی تھی کاش اسکی زندگی میں آنے والا محبت کا یہ دکھ بھی کافی کے ان جھاگوں کی طرح بالآخر کہیں تہہ میں خود ہی بیٹھ جائے اور پھر سب ویسا ہی پرسکون ہو جائے جیسا تھا۔

نہ جانے ماریو اور ماموں کے درمیان مزید کیا گفتگو ہوئی اور ہوئی بھی کہ نہیں، وہ اپنی سوچوں میں گم تھی جب اسے لگا جیسے وہ چونک گئی ہو، بے اختیار اس نے وہاں دیکھا جہاں ماریو بیٹھا تھا، وہ وہاں نہیں تھا، طلعت کی بے قرار نگاہ نے اس دروازے کو دیکھا جہاں سے وہ پہلی بار اس گھر میں آیا تھا۔ وہ جا رہا تھا اور شاید جاتے جاتے اس نے بھی پلٹ کر طلعت علی پر نگاہ ڈالی تھی، اس کی نگاہ کی نرم سی ٹیس نے ہی طلعت کو چونکایا تھا۔ وہ سبزے جیسے آنکھوں والی عام سی لڑکی جو شاید خاص ہوتی خوبصورتی میں اپنے ملک میں، ماریو کے لیے خاص نہیں بہت خاص تھی، اس لیے کہ اس کی روح کی کتنی گتھیاں جیسے کھلتی چلی جا رہی تھیں مگر اسے لگتا تھا کہ وہ تشنہ ہی رہ جائے گا اور یہ کہیں اس سے دور چلی

جائے گی۔ اس کی نگاہوں میں حسرت سی اترنے لگی تھی۔طلعت علی نے اسی لمحے اس کو دیکھا جب وہ اداس تاثرات کے ساتھ اس کو دیکھتا رخصت ہو رہا تھا۔ نگاہوں کے تصادم نے دلوں میں طوفان کی سی لہریں پیدا کردی تھیں۔ ماریو ایک جھٹکے سے مڑا اور باہر نکل گیا۔عثمان ملک نے بغور یہ دیکھا اور سوچ میں ڈوب گئے۔

کلون کی وہ خوبصورتی اور رعنائی جو طلعت علی کو بے حد پسند تھی، ماریو سے جدائی نے، یکلخت ختم سی کرد ی تھی۔ اس نے پاکستان اسی ہفتہ لوٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ماریہ مامی نے بھی اسے روکنے کی اپنی سی کوشش کرڈالی تھی لیکن سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ وہ مستقل انکار کررہی تھی۔

''طلعت! وہ تمہارے بنازندہ تو رہے گا لیکن رنجیدگی اس کے وجود سے لپٹ جائے گی میری جان، وہ میری اولاد نہیں ہے لیکن تمہارے ذریعہ میں اسے اور اپنے خاندان کو دین اسلام سے قریب لانے کی کوشش کرسکتی ہوں، اَت ہمیں ان سب انسانوں کو اس آگ سے بچانا ہوگا جس کا ایندھن ہی اب کی بغاوت والی زندگیاں ہیں۔''

ماریہ مامی بالآخر سسک پڑی تھی۔ وہ مستقل مصر تھی کہ اس نے پاکستان لوٹ جانا ہے۔ وہ کسی عیسائی کے ساتھ زندگی بتانے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''طلعت میری جان وہ عیسائی نہیں ہے، دیکھو اس کا باپ مسلم ہے، خود وہ بھی بہت جلد ہی مسلمان ہوجائے گا، بس تم اس کے ساتھ رہو۔''

ماریہ کی آواز رندھ چکی تھی، انہوں نے گزشتہ رات ہی عثمان ملک سے ماریو کا نمبر لے کر اسے فون کیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کی اپنی خالہ سے بات ہوئی بھی تو وہ دل خراش دور سے گزر رہا تھا۔''میں اس کے بغیر بھی مسلم ہی ہونگا، مجھے مسلمان ہونے کے لیے اس کی حاجت نہیں لیکن مجھے مسلمان رہنے کے لیے واقعی اسکی ضرورت ہے۔'' ماریو کی آواز میں تھکان رچی تھی۔ ماریہ اس تھکان کو بخوبی محسوس کرچکی تھی۔ اس لیے وہ دل سے پوری کوشش میں تھیں کہ طلعت کو یقین دلاسکیں کہ ماریو اس سے شادی کی خاطر مسلمان نہیں ہورہا۔

ماریہ کے ذہن میں صرف ماریو اور طلعت کی آپس میں ہم آہنگی اور اپنے خاندان سے تعلق کی استواری ہی ہدف تھے جب کہ طلعت علی کے لئے عباس محمود سے منگنی ختم کرکے ماریو کی سنگت اختیار کرنا بھی عظیم مسائل تھے۔ خاندان میں کتنی رنجشیں جنم لے سکتی تھیں اس رشتہ کی دراڑ سے وہ بخوبی جانتی تھی اور فیصلہ کن موڑ پر پہنچنے پر اس کو عباس محمود بھی ناقابل عبور خندق لگنے لگا تھا۔

''میں خود بات کرلوں گی تمہاری فیملی سے۔عثمان بات کرلیں گے۔ بس طلعت تم راضی ہوجاؤ۔'' ماریہ

مامی اس سے بات کرتے وقت جرمن اور انگریزی دونوں زبانوں کا استعمال کررہی تھیں۔ طلعت نے اپنے گود میں دھرے ہاتھوں کو ماریہ کے کندھوں پر رکھا اوران کے گلے لگ گئی۔

''ٹھیک ہے ماموں اورآپ مجھے شامل کیے بنا کوشش کرکے دیکھ لیں۔ اگر وہ سب ہنسی خوشی راضی ہوجاتے ہیں تو پھرٹھیک ہے۔''

اس نے سرگوشی کی سی آواز میں ماریہ سے کہا، حالانکہ یہ بات یقینی نظرآرہی تھی کہ یہ سب ہونا،اور وہ بھی ہنسی خوشی ناممکن ہے۔عثمان ملک کیا کہہ کر ماریو کی وکالت کرینگے جب کہ طلعت علی گزشتہ دوسال سے ان کے اپنے ہی بھانجے سے منسوب تھی۔ معاملہ ان کے لیے اپنے بیٹے کا بھی ہوتا تب بھی اچھے بھلے عباس محمود سے رشتہ ختم کرنا آسان نہ تھا۔تاثر یہ ہی آتا کہ طلعت کی رضا کی بنا پر ہی عثمان یہ کہہ رہے ہیں اور پھر بہن بھائیوں میں خلیج پیدا ہوجاتی۔

طلعت کا دل اندیشوں سے بھر چکا تھا۔ وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔سب ہی اس سے بے حد وحساب محبت کرتے تھے۔ اسے اپنے والدین اور بھائیوں سے کسی جبراور زیادتی کا خوف نہ تھا لیکن ان سب کو اپنی وجہ سے کسی امتحان میں ڈالنا بھی منظور نہ تھا۔ ماں سے وڈیو کال پر بات کرتے وہ رو پڑی تھی، ماں کو ہر بات اس نے صاف صاف بتادی تھی۔ وہ بھی متفکر تھیں کہ کیسے اس معاملہ کو سنبھالیں، بیٹی کے آنسو جب کہ وہ اتنے فاصلے پر ہو ان کو ہلا گئے تھے۔عباس محمود سے منگنی کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی وہ بس اس کی خوشی چاہتی تھیں۔ ہر اس راستہ کے ذریعہ جس میں کئی شرعی ممانعت نہ ہو۔طلعت علی کے والد بھی اپنے بچوں کے معاملے میں ان کی خوشی کو رسوم ورواج پر مقدم رکھنے والوں میں سے تھے۔ بس حق، ناحق کا فلسفہ سامنے رکھتے اور رشتہ چن لیتے۔ یہاں معاملہ بے حد گھمبیر تھا۔ دوسال عباس کو اور ان کی فیملی کو انتظار کرانے کے بعد اب کیسے اور کیا وجوہات بتا کر رشتہ ختم کیا جائے۔ ماں باپ دونوں ہی سخت الجھن میں تھے۔

یہ کیسا معاملہ تھا کہ جس کے لئے وہ عثمان ملک جنہوں نے مدت دراز سے فاصلہ قائم رکھا تھا، یکے بعد دیگرے کتنے فون کر چکے تھے۔ ہر فون پر وہ اتنی دلسوزی سے بات کرتے کہ طلعت کی ماں ثریا کا دل بھائی کی محبت سے بھی لبریز ہونے لگتا، اتنے عرصے بعد بھائی سے رابطے سے دل میں نرم نرم سی پھوار برسنے لگتی، یہ وہ اولاد تھی جن کے لئے انہوں نے اپنے ماں باپ کو مرتے دم تک فکر مند دیکھا تھا۔ حالانکہ عثمان ملک کی زندگی ایک کامیاب قالب میں ڈھل چکی تھی لیکن لوگوں سے ان کا غیر فطری گریز ان کو بیٹے کی جانب سے فکر مند کردیتا تھا اور تو اور وہ اپنے بہن بھائیوں سے بھی بات نہ کرتے تھے۔خصوصاً ایک بہنوئی کے ساتھ تو ان

کا رویہ بہت ہی ریزور ہوتا۔ دونوں بہنویوں کو بھی اپنا یہ سالا خاصا مغرور سا ہی لگتا۔ طلعت علی کے والد کو تاثرات چھپانے میں کمال تھا۔ وہ کبھی ظاہر ہی نہ ہونے دیتے کہ ان کو عثمان ملک کا گریز کیسا لگتا ہے۔ عباس محمود کے والد کے ماتھے پر بل ابھرتے تو وہ سب کو جائز ہی لگتا لیکن پردیس سے کچھ عرصے کے لئے آئے بیٹے اور بھائی کو ٹوکنا مشکل تھا، جب کہ وہ حساس بھی خاصا ہو۔ بچپن کی گرہیں مرتے دم تک بالعموم ساتھ ہی رہتی ہیں۔

انہیں اندازہ تھا کہ سترہ سال کی عمر تک لوگوں کا اس کو ہکلا کہنا اس کو کس قدر توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا تھا۔ اسکول کے ساتھیوں میں پہچان ہی یہ بنادی گئی تھی عثمان ہکلا۔ عثمان کا نام عثمان ملک ہے یہ اسکول کے کولیگز شاید ہی جانتے ہوں لیکن یہ ضرور جانتے تھے کہ عثمان ہکلا کس کلاس اور کس سیکشن میں ہے۔ سامنے کہنے والے کم تھے لیکن آوازوں کی بازگشت عثمان ملک تک پہنچ ہی جاتی تھی۔ وہ کوئی اعلیٰ پایہ کے ذہین نہ تھے اور اگر ہوتے بھی تو ظاہری خامی کو لوگ، خصوصاً محدود سوچ رکھنے والی قوم کے لوگ نظرانداز کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ہاں زمین اور اس کے اجزاء سے عثمان کی دلچسپی غیر معمولی بھی تھی اور اپنے ماحول کے حساب سے انوکھی بھی۔ ایک دن وہ اپنے اسکول کے گراؤنڈ کی مٹی کو بغور دیکھ رہے تھے کہ قریب سے گزرتے لڑکوں کی آوازوں نے ان کو سن سا کر دیا۔

''لو اب زمین سے، مٹی سے باتیں کرے گا، ہمیں تو بات سمجھ نہیں آتی اس کی، بے چارہ۔'' اور پھر ہنسی کی آوازیں بلند ہوگئیں۔ عثمان ملک نے زخمی دل سے ان جاتے ہوئے لڑکوں کو دیکھا، وہ ان سب کو جانتے تھے اور سب سے بلند قہقہہ جس کا تھا، اس کی بازگشت عثمان کو کہے تبصرے سے زیادہ تکلیف دہ لگی تھی۔ چھٹی جماعت کے عثمان ملک نے مہذب گھر میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کے کسی رشتہ دار نے کبھی بھی ایسا کوئی احساس نہ ہونے دیا تھا کہ جوان کو غمزدہ کردے لیکن باہر کی دنیا کی زبانوں کو قابو رکھنا گھر والوں کے بس میں ظاہر ہے نہ تھا۔ اب وہ عثمان ملک طلعت علی کے لئے اپنا ہر گریز بھلا کر مستقل رابطہ کر رہے تھے۔ طلعت کی والدہ کو اپنے بھائی سے بات کر کے بلاشبہ بے حد خوشی ہوئی تھی لیکن مسئلہ بدستور تھا کہ منگنی کیا کہہ کر ختم کی جائے۔

محض عثمان ملک کے کہنے پر ایسا نہ کیا جاتا اگر طلعت کی دلچسپی ظاہر نہ ہوئی ہوتی۔ حالانکہ اس نے بظاہر کوئی ایسا جملہ نہ کہا تھا جس کو دہرا کر یہ کہا جاتا کہ وہ ماریو کو پسند کرتی ہے لیکن ماں باپ اولاد کی خواہشات بن کہے سمجھ لیتے ہیں۔ یہ قانون ہر ایک پر لاگو نہیں ہوتا۔ لیکن طلعت کے والدین ضروران میں سے تھے جو آواز کے اتار چڑھاؤ اور آنکھوں میں اترے رنگوں

سے بچوں کو پہچان لیتے تھے۔ان کے لئے یہ جاننا کوئی مشکل نہ رہتا کہ ان کی بیٹی کا دل کہاں اٹک چکا ہے لیکن ذمہ دار اور باشعور انسان کی حیثیت سے وہ دل کے پیچھے بگٹٹ نہیں بھاگنا چاہتی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ طلعت مجبور ہو کر زندگی کا یہ اہم فیصلہ کرے۔ ورنہ ساری عمر مجبوری کے فیصلے کسک ہی دیتے ہیں۔

(جاری ہے)

محترمہ عفت قریشی سے ایک ملاقات

''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' مولوی ظفر اقبال کے گھر سے جو بیٹی اٹھی وہ یا تو ڈاکٹر بنی یا افسانہ نگار بنی اور کسی نے دونوں میدانوں میں قدم جما لیے۔ ان کے گھر کے احاطے میں بہن، بھائی، بیٹے سبھی نے ہر شعبہ میں اپنا مقام بنایا۔ ڈاکٹر، انجینئر، استاد، فوج غرض سبھی میدانوں میں کامیابیاں حاصل کیں مگر پڑھنے لکھنے سے سبھی نے رشتہ داریاں باندھیں۔ تقریباً سبھی بہنیں لکھتی رہیں مگر ان میں ''عفت قریشی'' جو سب سے کمزور اور دبلی پتلی تھیں، ایم اے عربی کر کے نہ تو پڑھائی میں کوئی چار چاند لگا سکیں نہ ہی گھریلو امور میں اپنا فن دکھا سکیں۔ بس چھوٹے چھوٹے کام کرتی رہیں۔ بچوں کے رسالے، پھول، ہدایت، تعلیم و تربیت سے لکھنے کا آغاز کیا۔ بعدازاں ''نائلہ'' کے نام سے حُور زیب النساء اور قندیل میں لکھتی رہیں۔ بتول میں اپنے نام سے لکھا۔ لکھتے لکھتے یکدم زقند لگائی اور اپنے سب بہن بھائیوں سے اپنا قد اونچا کر لیا اور ایک لازوال ناول ''زر سے ذات'' لکھ ڈالا جس کی بعد میں پی ٹی وی پر ''ساحل'' کے نام سے ڈرامائی تشکیل پیش ہوئی۔ جو خود تو ''منی'' ہیں مگر انھوں نے افسانے، ناول اور ان کے کردار بڑے قد آور تخلیق کیے ہیں۔ منی سادہ سے لباس میں رہتی ہیں۔ گہنوں سے بے نیاز بھی چمکتی دکھتی ہیں۔ پہلے زوجہ بنیں بعد میں ناول نگار۔ آیئے ان سے ملتے ہیں۔

س: آپ اپنا نام تاریخ پیدائش اور خاندانی پس منظر کے بارے میں بتائیں۔

ج: میرا نام عفت قریشی جبکہ قلمی نام نائلہ ہے۔ تاریخ پیدائش 5 ستمبر ہے، لاہور میں پیدا ہوئی۔ خواتین کا سن پیدائش نہیں لکھا جاتا اس لیے معذرت ہے۔ ہم کشمیر کے قریشی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے آباء واجداد حافظ قائم الدین عرف ولی اللہ زمانہ شباب میں اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ مہاراجہ گلاب سنگھ والیِ کشمیر کے ہاتھوں ستائے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ کے محلّہ میانہ پورہ میں آ گئے اور برس ہا برس وہیں پر رہے۔

میرے دادا کا نام منشی غلام قادر فصیح تھا وہ بہت مشہور سماجی شخصیت تھے۔ بے باک صحافی، بڑے ادیب اور مورخ بھی تھے۔ ان کے نام پر اسلامیہ پارک میں ایک سڑک فصیح روڈ کے نام سے منسوب ہے، سیالکوٹ کے محلّہ کمہاراں میں واقع فصیح صاحب کا ذاتی پریس بنام ''پنجاب پریس'' تھا۔ وہ سیالکوٹ سے ایک ہفتہ

وار رسالہ پنجاب گزٹ اور ایک ماہوار رسالہ ''پنجاب جرنل'' بھی شائع کرتے تھے۔ فصیح صاحب پہلے کانگریسی تھے بعد میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ سیاست وصحافت کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف میں بھی فصیح صاحب کا منفرد مقام تھا انگریزی اور اردو زبان پر کامل عبور تھا۔ تراجم کے علاوہ ڈرامے، ہفتہ وار رسالے، جغرافیہ، تاریخ عروض و بلاغت پر بھی ان کی کتب موجود ہیں۔

میرے والد پروفیسر ظفر اقبال شعبہ تعلیم سے وابستہ رہے وہ پنجاب یونیورسٹی میں بہت سے اہم عہدوں پر فائز رہے۔ اپنی ملازمت کے علاوہ بہت سے انتظامی اداروں سے منسلک رہے۔ انجمن حمایت اسلام، ٹریننگ انسٹی ٹیوشنز، پنجاب ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی پریس کے ساتھ بھی کام کیا۔ انھوں نے قرآن پاک کو تجوید سے لکھا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے بھائی ڈاکٹر ریاض قدیر کی تعلیم اپنی سخت نگرانی میں مکمل کروائی ان کی محنت رنگ لائی اور ان کے بھائی نے ملک کے معروف سرجن اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے نام کمایا۔

انھیں قرآن پاک کو تجوید سے لکھنے میں انتیس سال لگے۔ سعودی عرب میں صرف ان کا پاکستانی قرآن لانے کی اجازت ہے باقی پر پابندی ہے۔

س2: آپ کی تعلیمی قابلیت؟ بہن بھائی کتنے ہیں والدہ کے بارے میں بتائیں۔

ج: ہم چھ بہنیں اور چار بھائی ہیں۔ بنت الاسلام (پروفیسر صدر شعبہ اسلامیات) سعیدہ احسن (مدیرہ بتول ونور افسانہ نگار)، عفت قریشی، ڈاکٹر جودت ڈاکٹر سعدیٰ مقصود (مصنفہ) رافت، چار بھائی جن میں سے دو وفات پا چکے ہیں۔ سلیم اقبال فلائیٹ لیفٹیننٹ جن کا جہاز 1963ء میں کریش ہو گیا۔ وحید اقبال انجینئر، ڈاکٹر نعیم اقبال اور سعید اقبال پروفیسر ہیں۔ ہم سبھی بہن بھائیوں میں مثالی پیار ہے یہ سب ہماری والدہ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ میں جب لوگوں کو اور بہن بھائیوں کو آپس میں لڑتے جھگڑتے دیکھتی ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔

میری والدہ کا نام زبیدہ بیگم تھا وہ نہایت نیک صالحہ خاتون تھیں۔ اللہ والی تھیں۔ وہ بچپن سے دعائے گنج العرش پڑھتی رہی ہیں پہلے اپنے والدین کی صحت اور زندگی کے لئے دعا کرتیں شادی کے بعد اپنے بچوں کی زندگی اور صحت کے لئے دعا کے ساتھ یہ بھی دعا کرتیں کہ انھیں ایمان کی سلامتی رزق حلال اور ان کی آپس میں پیار محبت قائم رہے، اللہ نے سبھی قبول کر لیں۔

ہمارے والدین نے نہایت توجہ اور شفقت سے ہم سب بہن بھائیوں کی تربیت کی۔ ہمارے ابا جی نے پڑھائی کے معاملے میں ہماری بہت رہنمائی کی وہ ہمیں

بتاتے امتحان کی تیاری کیسے کی جاتی ہے پرچہ کیسے حل کیا جاتا ہے۔ سبق یاد کرنے کے کیا اوقات ہونے چاہئیں۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ تربیت بھی کی۔ مغرب کے بعد بھائیوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ دیر سے آنے پر بھی پابندی تھی۔ ہم سب بہن بھائی پانچ وقت کے نمازی اور میرے بھائی حافظ قرآن بھی ہیں۔ انھوں نے قرآن حفظ کر کے اپنی والدہ کی خواہش پوری کی۔ والدہ کی خواہش تھی کہ ان کے بچوں میں سے کوئی حافظ قرآن ہو۔ میری امی ابا جی کے کھانے پینے کا بہت خیال رکھتیں اپنے ہاتھوں سے انھیں کھانا ڈال کر دیتیں کسی دوسرے پر انھیں بھروسہ نہ تھا۔ جب تک ہمت تھی انھیں خود کھانا ڈال کر دیتیں جب بیمار پڑ گئیں تو ایک دن اشارے سے انھوں نے مجھے بلایا اور کہا اپنے باپ کو کھانا دو۔ جب میں کھانا لے کر ابا جی کے کمرے کی طرف جا رہی تھی تو آہستہ سے آواز دی کہ ٹرے دکھاؤ میں نے ٹرے آگے کر دی۔ سالن دیکھ کر انھوں نے دو انگلیوں سے اشارہ کیا کہ دو بوٹیاں اور ڈال دو۔ اس حالت میں بھی انھیں یہی خیال تھا کہ ان کے میاں کو کھانا ٹھیک طرح ملنا چاہیے۔

وہ طبیعت کے معاملے میں سخت اور دبنگ تھیں۔ ہماری تربیت انھوں نے گھر میں رہ کر کی۔ بچوں کی تربیت کی خاطر انھوں نے گھر سے قدم باہر نہیں نکالا۔ بچوں کو وقت پر کھانا دینا، کپڑوں کا خیال، ان کے سکول کالج کی ضروریات، پڑھائی کے معاملے میں سخت نگرانی کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم دس بہن بھائی سبھی ایک ہی لیول کے تھے۔ سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ کوئی ایک بھی دوسرے سے کم نہیں تھا۔

س: اپنے شوہر، سسرال اور بچوں کے بارے میں بتائیے۔

ج: میرے شوہر کا نام اصغر قریشی تھا۔ وہ آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے۔ محکمہ جنگلات میں ملازم تھے۔ ان کا گھر لاہور ہوٹل کے پاس تھا۔ جن دنوں وہ آکسفورڈ میں پڑھ رہے تھے۔ ان دنوں وہ کھانے کے معاملے میں بہت محتاط رہتے کہ کہیں کھانے میں حرام کی آمیزش نہ ہو جائے۔ وہ بازار سے زندہ مرغی خرید کر لاتے اور خود ہی ذبح کرتے اور پکاتے۔ پہلے تو تین ماہ ڈبل روٹی پر گزارا کیا بعد میں خود پکانا شروع کیا۔ اصغر کے والد پی ڈبلیو ڈی میں ملازم تھے۔

میری شادی کا بھی عجیب قصہ ہے (مسکراتے ہوئے) جب میری ساس رشتہ لینے ہمارے گھر آئیں تو انھوں نے میری والدہ سے کہا میرے دو ہی بیٹے ہیں اور میں اپنے دونوں بیٹوں کے لئے آئی ہوں جبکہ میری والدہ اور دیگر کا خیال تھا کہ وہ باجی سعیدہ کے رشتہ کے لئے آئی ہیں۔ میری والدہ نے پوچھا آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں تو انھوں نے کہا میرے دو ہی بیٹے ہیں میں چاہتی ہوں ان کے درمیان ہمیشہ اتفاق پیار و محبت

رہے یہ تب ہی ممکن ہے اگر ان کی بیویاں آپس میں بہنیں ہوں۔ میری والدہ مسکرائیں اور کہنے لگیں میں بڑی کا رشتہ تو کرنے کو تیار ہوں آپ لوگ مجھے پسند آئے ہیں مگر عفت بہت چھوٹی ہے اور فسٹ ائیر میں داخل ہوئی ہے میرا اور باجی کا ساڑھے تین برس کا فرق تھا مگر میں ڈیل ڈول میں بہت دبلی اور کمزور سی تھی۔ دیکھنے میں بہت چھوٹی دکھائی دیتی تھی میرا رنگ بھی باقی بہنوں کی نسبت کم گورا تھا۔ میری کھلائی مجھے ''سسّی'' کہہ کر پکارتی تھی۔ سسّی کے بارے میں سنا ہے وہ سانولی سلونی تھی۔

س : مگر آپ تو اچھی خاصی رنگت کی مالک ہیں کشمیریوں جیسا رنگ روپ ہے آپ کا؟

ج: (ہنستے ہوئے بولیں) باقی بہنوں کی نسبت کم ہی ہے۔

س: اچھا تو آپ شادی کی بات بتا رہی تھیں۔

ج: ہاں بی جی نے کہا عفت کی شادی بی اے سے پہلے ممکن نہیں پہلے بڑی کا رشتہ ہو جائے پھر اس کے بارے میں سوچیں گے۔ مگر میری ساس کو نہ جانے کیا خدشہ تھا انھوں نے کہا میں انتظار کرلوں گی مگر دونوں کو اکٹھا لے کر جاؤں گی۔ بی اے کرنے کے بعد وہ دوبارہ آئیں مگر میں بضد تھی کہ باجی نے ایم اے کرلیا میں بھی ایم اے کروں گی مگر باجی کے اصرار پر میں نے شادی کے لئے حامی بھر لی اور یوں ہم دونوں بہنوں کی اکٹھی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد عربی میں ایم اے کیا۔

مجھے گھر کا کام کرنے کی بالکل عادت نہیں تھی۔ باجی نے سسرال جا کر سبھی کام سنبھال لیے اور میں کام کرنے سے بچی رہی۔ کچھ عرصہ بعد میرے میاں اصغر کی تبدیلی پشاور ہوگئی۔ وہاں ڈرائیور، خانساماں، چپڑاسی، مالی اور اوپر کے کام کرنے والا لڑکا بھی تھا۔ اس لیے مجھے کوئی کام نہیں کرنا پڑا اور میں لکھنے پڑھنے میں مصروف رہی۔ میرے میاں بھی اچھا خاصا کھانا بنا لیتے تھے انھیں باہر رہ کر کھانا بنانا آ گیا تھا۔

س: شادی کی تقریب کے بارے میں بتائیں۔

ج: جب ہماری شادیاں ہوئیں تو میرے سسر نے کہا ہم نے جہیز نہیں لینا۔ بی جی نے ضرورت کی چیزیں پیٹی میں ڈال کر ہمارے ساتھ بھیج دیں۔ اس پر وہ بہت ناراض ہوئے اور کہا یہ سب واپس کر دیں۔ میری ساس بہت سمجھدار اور عقل مند خاتون تھیں انھوں نے کہا یہ ان بچیوں کی استعمال کی چیزیں ہیں انھیں رہنے دیں واپس نہ کریں انھیں مشکل ہو گی۔ یوں وہ پیٹی واپس جانے سے بچ گئی۔ ہماری بارات میں بہت مختصر سے لوگ آئے۔ انھوں نے ابا جی کو کھانا کھلانے سے منع کر دیا۔ جون کا مہینہ تھا سخت گرمی تھی کپڑے پہننے دشوار ہو رہے تھے۔ مہمانوں کی مشروبات اور آئس کریم سے تواضع کی گئی۔ ولیمہ انھوں نے بہت شاندار کیا سبھی رشتہ داروں کو بلایا گیا۔ میرے سسر نہایت نیک اور پرہیز گار آدمی

تھے۔ انھیں مسجد سے بہت محبت تھی۔ ملازمت سے واپس آ کر مسجد چلے جاتے اور وہاں جا کر جماعت کرواتے۔

س: آپ کی ازدواجی زندگی کیسی رہی؟

ج: میں نے اپنی ازدواجی زندگی کے اٹھارہ برس اصغر کی بھرپور محبت میں گزارے۔ اصغر بے حد پیار کرنے والے شوہر اور نہایت شفیق باپ تھے۔ بچوں سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ اپنی بیٹیوں کو نہایت عزت اور احترام سے بلاتے۔ جیسے اِفّی جی، رینو جی، سیمی کو کہتے ابوتاتی (ابا کی کا کی) بیٹے مون سے حد درجہ محبت اور پیار تھا۔ ایک بار امریکہ سے آئے تو سبھی کے لئے تحفے تحائف لائے مگر میرا تحفہ سب سے قیمتی تھا۔ مجھے فون پر پوچھا تمہارے لیے گاڑی لے آؤں میں نے کہا ''لے آئیں'' بولے ''مگر ایک شرط ہے گاڑی تمہیں خود چلانی ہوگی۔'' وہ میرے لیے گاڑی لے آئے مگر میں چاہتی تھی کہ ہمارا گھر پہلے بن جائے۔ میں نے ان سے کہا اگر آپ کہیں تو میں یہ گاڑی بیچ کر پلاٹ لے لوں تو بولے تمہاری چیز ہے جو چاہے کرو۔ ان دنوں میرے بڑے بھائی ڈاکٹر نعیم اقبال گاڑی خریدنا چاہ رہے تھے میں نے گاڑی ان کے ہاتھ بیچ کر فصیح منزل کے سامنے ایک کنال کا پلاٹ خرید لیا۔

س: جوانی میں ہی زندگی کا ہم سفر جدا ہو گیا۔ اتنے بڑے سانحے کو کیسے برداشت کیا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ کیسے زندگی کے شب و روز گزارے؟

ج: وہ غمگین لہجے میں گویا ہوئیں، آسیہ میں تمہیں کیا بتاؤں۔۔۔ میری شادی کو ابھی اٹھارہ برس ہوئے تھے۔ میرے بچے ابتدائی جماعتوں میں پڑھ رہے تھے۔ میرا بیٹا صرف پانچ برس کا تھا۔ جس روز یہ حادثہ ہوا میں فصیح منزل میں تھی۔ اصغر کے چچازاد بھائی شبیر آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کوئی فتویٰ لینے جامعہ اشرفیہ جانا تھا وہ اصغر کو ساتھ لے گئے۔ جانے سے پہلے مون ان کی گود میں تھا وہ ساتھ جانے کی ضد کر رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولے مون کو پکڑ لو میں شبیر کے ساتھ جا رہا ہوں۔ وہ چلے گئے اور میں بچوں میں مصروف ہو گئی۔ مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی میں سب کام چھوڑ کر باجی سعیدہ کے گھر کی طرف چل پڑی ان کا گھر قریب تھا۔ جہاں اب عمران کلینک بنا ہوا ہے۔ میں کافی دیر تک گھنٹی بجاتی رہی بہت دیر بعد باجی کی بیٹی عرفی نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ روتے ہوئے بولی، منی خالہ خالو جان اب ٹھیک ہیں، خالو جان اب ٹھیک ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے وہ بولی آپ کو نہیں پتا ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اصغر زندگی اور موت کی کشمکش میں آٹھ دن ہسپتال میں رہے۔ ہسپتال میں انھوں نے صرف ایک ہی بات کی، مون کیسا ہے؟ خوش ہے سکول جا رہا ہے؟ آٹھویں دن ان کی میت فصیح

منزل لائی گئی۔ میں اس حادثے کے بعد گنگ رہ گئی۔ میں رونا چاہتی تھی مگر میرا ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ مجھے سکتہ ہوگیا تھا۔ میرے ابا جی نے کہا جب تک میت اٹھ نہیں جاتی یہ دعا پڑھو اللھم اغفرلہ وارحمہ اس دعا نے مجھے بہت سہارا دیا۔ آپا جی بنت الاسلام نے مجھے ایک دعا بتائی وہ میں ابھی تک پڑھتی ہوں رب لا تذرنی فردا وانت خیرالوارثین۔

قرآن کی اس دعا نے زندگی کے ہر مشکل موڑ پر میرا ساتھ دیا مجھے تمام زندگی کبھی کسی آزمائش میں نہیں ڈالا۔ میرے تمام بچے بہت لائق، فرمانبردار اور اللہ کی راہ پر چلنے والے ہیں۔ بچوں کو ذہانت باپ کی طرف سے ملی تھی۔ اصغر غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔ ان کے اساتذہ ان کے امتحانی پرچے دیکھ کر بغیر چیک کیے سو میں سے سو نمبر دے دیتے کہ اس کے پرچے میں غلطی ہو ہی نہیں سکتی تبھی تو وہ آکسفورڈ بھی پڑھنے گئے۔ میرے بیٹے مون کا حساب بہت اچھا ہے وہ کہا کرتا تھا میرا دل چاہتا ہے میرے کورس میں حساب کے علاوہ کوئی اور پرچہ نہ ہو۔ میری بیٹی نورین چھٹی جماعت سے لے کر میڈیکل کالج تک سکالرشپ لیتی رہی۔

س: آپ نے کس عمر سے لکھنا شروع کیا نیز لکھنے کی طرف کیسے رجحان ہوا؟

ج: ہمارے گھر کا ماحول لکھنے والا تھا سبھی لکھتے تھے۔ پہلا مضمون ساتویں جماعت میں لکھا۔ سید امتیاز علی تاج کے رسالے پھول میں بھیجا۔ نوائے وقت کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن میں بھی میرے افسانے چھپتے رہے۔ ہدایت، تعلیم و تربیت اور ایک بچوں کا رسالہ دہلی سے نکلتا تھا اس میں میری کہانیاں چھپتی تھیں۔

افسانہ میں نے نویں جماعت میں لکھنا شروع کیا۔ حور، زیب النساء، قندیل میں میرے افسانے چھپتے رہے ہیں ان دنوں ''نائلہ'' کے قلمی نام سے لکھا کرتی تھی۔ میری دو کتابیں چھپ چکی ہیں ''وسعت دل'' جو افسانوں پر مشتمل ہے اور ایک ناول ''زر سے ذات'' جو قسط وار بتول میں شائع ہوتا رہا۔ بعد میں پی ٹی وی سے ''ساحل'' کے نام سے دکھایا گیا۔ یہ ڈرامہ تیرہ قسطوں میں بنا۔ یہ بالکل ویسا نہیں تھا، ناول کے مطابق نہیں تھا۔ ان سے پوچھا گیا تو ڈائریکٹر نے کہا ڈرامائی تشکیل کے لئے تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔

س: زر سے ذات کی کہانی کیا تھی کچھ بتایئے؟ اس کا خیال کیسے آتا؟

ج: ہمارے محلے میں ایک عورت اکثر بی جی سے ملنے آتی اور آکر بی جی کو اپنی زندگی کے حالات سناتی پھر اس کی بہو کا بھی آنا جانا ہوگیا وہ بھی بی جی سے اپنی گھریلو زندگی ڈسکس کرتی رہتی۔ میں چلتے پھرتے ان کی باتیں سنتی رہتی اور یوں میں نے کہانی لکھنی شروع کر دی لکھتے لکھتے وہ چالیس صفحے کی ہوگئی۔ میں نے آپا جی بنت الاسلام کو بتایا تو انھوں نے مجھے انگیخت کیا اور میں

نے بتول میں قسط وار دینی شروع کر دی۔

س: کہانی کیا تھی؟

ج: زر سے ذات ایک معاشرتی کہانی ہے جو ہر دوسرے گھر کے مسائل کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ لالچ، حرص اور خودغرضی کی ایسی کہانی ہے جو ایک دولت مند خاتون اور اس کی بہو جو ایک شریف زادی ہے مگر مفلوک الحال بیوہ کی بیٹی ہے، کے گرد گھومتی ہے۔ دولت مند خاتون اپنی قلاش بہو پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتی ہے کہ وہ جہیز میں دنیاوی ساز وسامان کیوں نہیں لے کر آئی۔ بہو کے دو بچے ہو جاتے ہیں شوہر حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ مرنے سے پہلے اپنی کچھ جائیداد اور اچھی خاصی معقول رقم بیوی کے نام کر دیتا ہے۔ ماں کو جب یہ سب معلوم ہوتا ہے تو وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو کہتی ہے کہ وہ بیوہ بھابھی سے شادی کر لے تاکہ مال و دولت دوبارہ ان کے پاس آ جائے۔ چھوٹا بیٹا خلوص نیت اور سچائی کے ساتھ اسے پسند کر لیتا ہے۔ کہانی نہایت دلچسپ موڑ لے کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس ناول کی ہیروئن نیلی کا دامن جب تک دولت سے خالی تھا اس کی گھر میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ جب اس کے پاس دولت آ گئی تو اس کی ذات یکدم معتبر ہو گئی۔ سب اس کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ گویا زر سے ذات ہے۔

س: کیا آپ نے اپنے تمام افسانے چھپوائے؟

ج: میں نے ابھی تمام افسانے کتابی شکل میں نہیں چھپوائے۔

س: کون سے ادیب سے آپ متاثر ہیں آپ نے کسے بہت پڑھا؟

ج: میں نے بہت کتابیں پڑھی ہیں بہت سے لکھنے والوں میں سے وقت کے مطابق یا کہہ لیں اس دور کے مسائل کے مطابق جو بھی اچھا لگتا رہا مجھے متاثر کرتا رہا مگر ہر کوئی مکمل یا پرفیکٹ نہیں ہوگا اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سی کتاب یا مصنف پسند ہے۔

س: آخر کسی نے تو آپ کو متاثر کیا ہوگا؟

ج: طالب علمی کے دور میں نسیم حجازی کو بہت پڑھا ہے بعد میں اشفاق احمد کی تحریریں متاثر کن رہیں۔ اشفاق کا ڈرامہ ''گڈریا'' لازوال افسانہ ہے۔ جو مجھے بہت پسند ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری نے ہر دور میں راہنمائی کی۔

س: زندگی میں کوئی ایسی دعا جو مانگی ہو اور پوری ہوئی ہو؟

ج: دعا تو زندگی کا حصہ ہے۔ اصغر کی وفات کے بعد میں فصیح منزل کے اپر پورشن میں رہتی تھی۔ ایک روز میں چھت پر کھڑی سامنے اپنے پلاٹ کو دیکھ رہی تھی میں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ کیا اس پلاٹ پر میرا گھر بن جائے گا؟ وہ قبولیت کا لمحہ تھا کچھ ہی عرصہ بعد اصغر کے دفتر سے کچھ روپے ملے، کچھ والدین سے ترکہ ملا یوں اللہ تعالیٰ نے باعزت طریقے سے رہنے کو گھر بنا

دیا۔

س: کیا آپ کو سیر و سیاحت کا شوق رہا ہے؟

ج: جی ہاں! بہت، مجھے سیر و سیاحت کا بہت شوق رہا ہے میں نے تقریباً سارا پاکستان دیکھ لیا ہے۔ چترال، نیلم ویلی تک ہم نے تمام پہاڑی مقامات دیکھ لئے ہیں۔

س: کیا آپ بیرون ملک بھی گئی ہیں؟

ج: حج کے لئے سعودی عرب گئے تھے وہ سفر ابھی بھی بہت یاد آتا ہے (حج کا ذکر کرتے ہوئے وہ بہت پرجوش ہوگئیں ان کی آنکھیں چمکنے لگیں) ہم نے حج بحری جہاز میں کیا تھا۔ سات دن جانے میں لگے اور سات ہی آنے میں۔ بحری جہاز اندر سے اتنا بڑا تھا جیسے کوئی شہر آباد ہو بڑے بڑے کمرے تھے ہمیں لگا ہم گھر کے کسی آرام دہ کمرے میں رہ رہے ہیں۔ جہاز کے عرشے پر مسجد تھی جہاں جمعہ کی نماز ہم پڑھتے تھے۔ جا بجا دکانیں سجی ہوئی تھیں ڈاکٹر کے کلینک ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس سفر میں میرے میاں، ساس، سسر دونوں نندیں افی اور نورین بھی ساتھ تھیں۔ نورین ان دنوں اڑھائی ماہ کی تھی افی تین سال کی تھی۔ جہاز میں ایک عورت وفات پا گئی۔ اس کی وفات نے سبھی کو غمزدہ کر دیا۔ اسے نہلا دھلا کر کفن پہنا کر سمندر میں پھینک دیا گیا۔ یہ منظر دل کو چھو گیا۔ پندرہ دن جدہ میں رہے۔ آٹھ دن مدینہ میں پون مہینہ مکہ میں رہے۔

س: آپ کے خیال میں ادب کی کونسی صنف معتبر ہے یا کہہ لیں قاری کو متاثر کرتی ہے۔ شاعری، مضمون، افسانہ، ڈرامہ وغیرہ۔

ج: دیکھا جائے تو ہر صنف ہی معتبر ہے شاعری کا اپنا مزاج ہے مضمون کی اپنی افادیت ہے، آج کل ڈراموں کا دور ہے مگر میں سمجھتی ہوں افسانہ سب سے زیادہ لوگوں کی توجہ سمیٹنے میں کامیاب رہتا ہے۔ افسانے کے ذریعے آپ بغیر پند و نصائح کے اپنی بات با آسانی دوسروں کو ذہن نشین کروا دیتے ہیں۔ اس لیے لکھاریوں کو افسانہ لکھنے پر توجہ دینی چاہیے۔

س: نئے لکھاریوں کے لئے کوئی پیغام؟

ج: جو بھی لکھیں با مقصد لکھیں۔

س: جن دنوں بتول شروع ہوا ان دنوں کی کوئی یادداشت بتائیں؟

ج: بتول سے پہلے ''عفت'' شروع ہوا تھا۔ ان دنوں میں بہت چھوٹی تھی مجھے یاد ہے آپا جی حمیدہ بیگم، میرے آپا جی بنت الاسلام، سعیدہ باجی، رخشندہ کوکب، ام زبیر وغیرہ ہمارے گھر جمع ہوتے ان کی میٹنگیں ہوتیں کہ ہم ایک ادبی اور اصلاحی پرچہ شروع کرنا چاہتے ہیں۔ ایک روز اس کے نام پر غور و فکر ہو رہا تھا تو میں بھی ان کے درمیان آ بیٹھی۔ میں نے کہا عصمت، بنات، تو پہلے ہی چھپ رہے ہیں آپ پرچے کا نام ''عفت'' رکھ لیں۔ یوں پرچے کا نام عفت رکھ لیا گیا

جو چند ہی سال بعد بند کرنا پڑا اور اس کی جگہ بتول کی شروعات ہوئی۔

س: تو گویا آپ کے نام پر اور آپ کے مشورے سے عفت کا نام رکھا گیا۔

ج: جی یہی سمجھ لیں۔

س: زندگی کا کوئی نا قابل فراموش واقعہ بتائیں؟

ج: نا قابل فراموش واقعہ تو مجھے یاد نہیں مگر ایک خواب میں آپ کو سناتی ہوں۔ میں نے خواب دیکھا جیسے دو بچے بھاگ رہے ہیں۔ ایک نے سفید نیکر پہنی ہے دوسرے نے نیلی۔ میں انھیں آواز دے کر بلا رہی ہوں۔ عامر جلدی آؤ۔ میرے پاس ان میں سے ایک میرے پاس آجاتا ہے دوسرا بھاگ جاتا ہے۔ اس خواب کے اگلے دن اطلاع آئی۔ میری بہن زری جو دبئی میں تھی۔ اس کے ہاں بیٹا ہوا ہے انھوں نے اس کا نام عامر رکھا ہے۔ میں نے سوچا اب منیر میرے ہاں آئے گا۔ کیونکہ یہ منیر کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے کا خواب تھا۔ میری ایک ہمسائی پشاور سے خصوصی طور پر میرے پاس آئی۔ اس نے کہا اگر تمہارے ہاں بیٹا ہوا تو تم اس کا نام منیر ہی رکھنا۔ آپا جی نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ بیٹے کا نام منیر رکھنا۔ پھر اللہ نے مجھے بیٹا دیا اور میں نے اس کا نام منیر ہی رکھا جس کے معنی ہیں روشنی پھیلانے والا۔

ایک اور سچا خواب میں نے دیکھا۔ ایک لاؤنج ہے جس میں چار کمرے ہیں وہاں سے سیڑھیاں اوپر کو جا رہی ہیں۔ ایک بچہ سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ آخری سیڑھی سے ایک سیڑھی کم پر جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ آگے دروازہ بند ہے اس خواب کے بعد میری بیٹی نوشین نے میٹرک کے امتحان میں پنجاب بھر میں دوسری پوزیشن لی۔ یہ دونوں خواب مجھے اکثر یاد آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے یہ خواب نہیں تھے بلکہ میں جاگتی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

س: آج کل کیا مصروفیات ہیں؟

ج: آج کل طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ دو بیٹیاں میرے پاس ہوتی ہیں۔ افلین اوپر کی منزل پر ہوتی ہے اور نوشین میرے پاس۔ ان کے بچوں اور گھر کی نگرانی میرے سپرد ہے۔ ان کی ملازماؤں سے کام کروانا اور ان کے جاب سے آنے کے بعد تک بچے میرے پاس ہوتے ہیں۔

س: آپ کے کتنے بچے ہیں؟

ج: میرے چار بچے ہیں، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ تینوں بیٹیاں ڈاکٹر ہیں۔ افلین، نورین اور نوشین۔ افلین فاطمہ جناح میں پڑھاتی ہیں، نورین فیملی پلاننگ ہسپتال میں جاب کرتی ہیں، نوشین ثریا عظیم ہسپتال میں گائنی کی ڈاکٹر ہیں، بیٹا منیر دُبئی کے اسلامک بینک میں جاب کرتا ہے، اس نے ایم بی اے کیا ہے۔

س: افلین کے کیا معنی ہیں یہ بہت خاص سا نام

ہے؟

ج: افلین ترکی نام ہے اس کے معنی خوشی کے ہیں۔

س: فارغ اوقات کیسے گزارتی ہیں؟

ج: اللہ کو یاد کیا یا میل ملاقات کر لی۔ لکھنا پڑھنا ختم ہے۔ اخبار بھی مشکل سے پڑھتی ہوں۔ کوئی غیر معمولی ڈرامہ ہو تو وہ ٹی وی میں دیکھ لیتی ہوں جیسے آج کل عمیرہ احمد کے ڈرامے بہت اچھے ہوتے ہیں۔

س: آپ کو اپنی کون سی عادت پسند ہے؟

ج: (ہنستے ہوئے) میں تو تمام دن اپنی ذات میں سے نقص ہی نکالتی رہتی ہوں۔ یہ بات دوسرے ہی بتا سکتے ہیں کہ مجھ میں کون سی اچھی عادت ہے۔

س: آپ کی پسندیدہ شخصیت کونسی ہے؟

ج: کوئی شخص مکمل نہیں ہوتا۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکتی کہ فلاں مجھے بہت پسند ہے کسی کی باتیں اچھی لگتی ہیں اور کسی کی عادات متاثر کرتی ہیں۔

س: آپ نوجوان نسل کے لئے رول ماڈل کسے سمجھتی ہیں؟

ج: جو اللہ کے راستے پر چلے اور اس کے دین پر عمل کرے وہی رول ماڈل ہے۔

س: لوگوں کا کون سا رویہ آپ کو دکھی کرتا ہے؟

ج: جو لوگ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ چغلی اور جھوٹ سے نفرت ہے۔

س: خوشی کے موقع پر آپ کیا کرتی ہیں؟

ج: جب جب خوشی ملی اللہ کا شکر ادا کیا۔ دو نفل شکرانے کے پڑھ لیتی ہوں۔

س: آپ کے نزدیک زندگی میں دولت، عزت، شہرت میں سے کس کی زیادہ اہمیت ہے؟

ج: زندگی میں عزت کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اور جو اللہ کے نزدیک باعزت ہو وہی عزت والا ہے۔

س: بے لگام میڈیا کے اس دور میں بچوں کو اس کے برے اثرات سے کیسے بچائیں؟

ج: ہم بچوں کو ٹی وی دیکھنے سے منع نہیں کرتے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی تربیت بھی کرتے ہیں کہ وہ برے پروگرام نہ دیکھیں۔ انھیں اچھے برے کا فرق سمجھانا بہت ضروری ہے۔ کچھ بچے کارٹون دیکھتے ہیں کچھ میچ کے شوقین ہوتے ہیں۔ بڑے ڈرامہ دیکھ لیتے ہیں۔ ہم نے بچوں کو گانے اور فلمیں دیکھنے کی اجازت نہیں دی۔

س: زندگی میں کوئی ایسا کام جو آپ نے ابھی تک نہیں کیا اور دل میں حسرت ہے؟

ج: زندگی نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے مگر ایک خلش دل میں ہے کہ میں دین داری میں جس حد تک جانا چاہتی تھی وہاں تک نہیں جا سکی۔

س: موسم کون سا پسند ہے؟

ج: جو موسم تنگ کرے وہ پسند نہیں۔

س: کھانے میں کیا پسند ہے؟ رنگ اور لباس کون سا اچھا لگتا ہے؟

ج: کھانا مجھے اپنی امی کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند تھا۔ مرغی بالکل پسند نہیں ہے۔ لیکن آج کل گھر میں زیادہ تر مرغی ہی پکتی ہے۔ اب کھا لیتی ہوں۔ رنگ سفید اور سیاہ پسند ہے۔ لباس میں شلوار قمیض پسند ہے۔

س: بتول کے قارئین کو کوئی پیغام دیں؟

ج: تمام بہنوں اور بیٹیوں سے گزارش ہے اپنی اولاد کی تربیت کی طرف توجہ دیں۔ انھیں دین اور دنیا دونوں کے علوم سکھائیں۔ ان کی نمازوں کا خیال رکھیں۔ اور انھیں سچا مسلمان بنائیں۔

آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے اپنے قیمتی وقت میں سے ہمارے ساتھ بات چیت کے لئے وقت نکالا۔

☆☆☆

میری لائبریری سے

نام کتاب تیسری جنگ عظیم اور دجال
مصنف مولانا عاصم عمر
پبلشر الہجرہ پبلی کیشنز

پیارے قارئین ! با کمال، لا جواب، بہترین، کسی زمانے میں یہ الفاظ بلاشبہ پاکستان کی قومی ائیر لائن پی آئی اے کے لئے فخریہ کہے جاتے تھے لیکن آج جو کتاب میرے ہاتھ میں ہے اس کتاب کا گو کہ میں پہلے بھی ایک دو دفعہ مطالعہ کر چکی ہوں لیکن اسی ہفتہ میں اس کتاب کے مطالعہ نے میری بہت سی ذہنی الجھنیں حل کر دی ہیں۔۔۔ بہت سے ایسے نکات ہیں جو پہلے نظروں سے گزرا کرتے تھے لیکن دل میں جگہ نہیں بنا پاتے تھے اس کتاب نے یہ سب غلط ثابت کر دیا ہے۔۔۔ اس کتاب پر میں کوئی تبصرہ یا تعریفی کلمات لکھنے کی بجائے صرف اور صرف چند احادیث (حالات حاضرہ کے تناظر میں) پیش کر دوں تو کیسا رہے گا؟ خاص طور پر مصر، عراق اور شام میں ہونیوالے اذیت ناک واقعات کے متعلق احادیث۔

تو آیئے بسم اللہ کرتے ہیں لیکن بسم اللہ سے پہلے چند معروضات:

یہ احادیث وہ پیش گوئیاں ہیں جو حضرت محمدؐ نے قیامت تک آنے والے واقعات سے متعلق پیش فرمائی ہیں۔ ان احادیث کا مطالعہ قارئین کے لئے بالعموم اور مدرسین اور مدرسات کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگا (انشاءاللہ)۔

۱۔ حضرت ابو سعید خدری سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا تم ضرور پہلے لوگوں کی روش اور طریقہ کی مکمل طور پر اتباع کرو گے یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں داخل ہوئے تو تم بھی ان کی اتباع میں اس میں داخل ہو گے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا یارسولؐ اللہ پہلے والوں سے مراد یہود و نصاری ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا تو اور کون؟

(اس کی روشنی میں اپنے کھانے پینے کے طریقے سے ڈگریوں کے حصول اور ملازمتوں تک کا جائزہ لے سکتے ہیں)۔

۲۔ عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا جب کسی قوم کے گناہ زیادہ ہو جاتے ہیں تو ان کی مسجدیں زیادہ خوبصورت بنائی جاتی ہیں اور خوبصورت مساجد دجال کے خروج کے وقت ہی میں بنائی جائیں گی۔

۳۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ آپؐ نے

فرمایا کہ لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ اس میں لوگ سود کھائیں گے حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کسی نے پوچھا کیا تمام لوگ سود کھائیں گے، تو حضرت محمدؐ نے فرمایا ''ان لوگوں میں سے جو شخص سود نہیں کھائے گا اس کو سود کا کچھ غبار پہنچے گا۔

۴۔ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا میری امت پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ ان میں قراء (قاری کی جمع) بہت ہونگے اور دین کی سمجھ رکھنے والے کم ہونگے۔علم اٹھا لیا جائے گا اور ہرج زیادہ ہو جائے گا۔ صحابہؓ نے پوچھا یہ ہرج کیا ہے؟ فرمایا تمہارے درمیان قتل۔ پھر اس کے بعد ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ قرآن پڑھیں گے حالانکہ قرآن ان کے حلق سے نہیں اترے گا پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ منافق، کافر، مشرک، مومن سے دین کے بارے میں جھگڑا کریں گے (بلاتبصرہ! ہر لفظ برحق)۔

۵۔حضرت محمدؐ نے فرمایا: علماء پر ضرور ایسا زمانہ آئے گا کہ ان کو ایسے قتل کیا جائے گا جیسے چوروں کو قتل کیا جاتا ہے تو کاش کہ اس وقت علماء جان بوجھ کر انجان بن جائیں۔

(علماء نبی کے وارث ہوتے ہیں ان کے قتل یا کسی فلم سٹار یا سیاست دان کے قتل پر میڈیا ئی جائزہ ذہن میں رکھیں)۔

۶۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا قیامت اس وقت تک نہیں آ سکتی جب تک زمانہ آپس میں قریب نہ ہو جائے چنانچہ سال مہینے کے برابر، مہینہ ہفتہ کے برابر اور ہفتہ دن کے برابر اور دن گھنٹہ کے برابر اور گھنٹہ کھجور کی پتی یا شاخ کے جلنے کی مدت کے برابر ہو جائے گا (مجھے تو سن بھی یاد نہیں رہتے!!)۔

۷۔ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کی قریبی علامتوں میں سے ایک چاند کا پھیل جانا ہے اور یہ کہ پہلی تاریخ کے چاند کو یہ کہا جائے گا کہ یہ دوسری کا چاند ہے۔

۸۔ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک درندے آدمیوں سے بات نہ کرنے لگیں اور آدمی کے چابک کا پھندہ اور اس کے جوتے کا تسمہ اس سے بات نہ کرنے لگے اور انسان کی ران اس کو یہ بتایا کرے گی کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر والوں نے کیا بات کی اور کیا کام کیے۔

(الیکٹرانک چپ سے یہ سارے کام ہو جاتے ہیں ٹانگ بازو پر لگانے کے تجربے ہو رہے ہیں)۔

۹۔ابو بکرہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک ہر قوم کے حکمران ان کے منافق نہیں بن جاتے۔

۱۰۔حضرت حذیفہؓ سے ''اگر تم میں سے کوئی شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ فتنے میں مبتلا ہوا ہے یا نہیں تو اس کو چاہیے کہ وہ یہ دیکھے کوئی ایسی چیز جس کو پہلے وہ حرام سمجھتا تھا اب اس کو حلال سمجھنے لگا ہے وہ بلا شبہ فتنے میں مبتلا ہوا۔ یا کوئی ایسی چیز جس کو پہلے وہ حلال سمجھتا تھا اب اس کو حرام سمجھنے لگا ہے وہ بلا شبہ فتنے میں مبتلا ہوا۔

۱۱۔عبدالرحمان زید بن اسلم سے آپ ﷺ نے فرمایا :''جب تک آسمان سے بارش برستی رہے گی تب تک جہاد تر و تازہ رہے گا اور لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ جب ان میں پڑھے لکھے لوگ بھی یہ کہیں گے کہ یہ جہاد کا دور نہیں ہے لہٰذا ایسا دور جس کو بھی ملے وہ جہاد کرے۔وہ جہاد کا بہترین زمانہ ہوگا۔صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ کیا کوئی مسلمان بھی ایسے کہہ سکتا ہے؟ فرمایا ہاں جن پر اللہ کی لعنت،فرشتوں کی لعنت اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی۔

شام اور مصر کے متعلق احادیث

۱۲۔جابر بن عبداللہؓ سے آپ ﷺ نے فرمایا ''وہ وقت قریب ہے کہ عراق والوں کے پاس غلہ اور روپے پر پابندی لگا دی جائے گی۔ان سے پوچھا جائے گا کہ یہ پابندی کسی کی جانب سے ہوگی تو آپ ﷺ نے فرمایا عجمیوں (Non-Arabs) کی جانب سے۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا ''وہ وقت قریب ہے کہ جب اہل شام پر بھی یہ پابندی لگا دی جائے گی۔ پوچھا گیا یہ رکاوٹ کس کی جانب سے ہوگی فرمایا ''اہل روم (مغرب) کی جانب سے۔

مدینہ منورہ کا محاصرہ:

حضرت معجن ادرع فرماتے ہیں آپ ﷺ نے ایک دن لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا یوم الخلاص، یوم الخلاص و یوم الخلاص۔کسی نے پوچھا یہ یوم الخلاص کیا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا ''دجال آئے گا احد کے پہاڑ پر چڑھے گا پھر اپنے دوستوں سے کہے گا کیا اس قصر ابیض (سفید محل) کو دیکھ رہے ہو یہ احمد ﷺ کی مسجد ہے پھر مدینہ منورہ کی جانب آئے گا تو اس کے ہر راستے پر ننگی تلوار لیے ایک فرشتے کو مقرر پائے گا چنانچہ سبخۃ الجرف کی جانب آئے گا اور اپنے خیمے پر ضرب لگائے گا پھر مدینہ منورہ کو تین جھٹکے لگیں گے جس کے نتیجہ میں ہر منافق مرد و عورت اور فاسق مرد عورت مدینہ سے نکل کر اس کے ساتھ چلے جائیں گے اس طرح مدینہ گناہ گاروں سے پاک ہو جائے گا اور یہی یوم الخلاص ہے''۔

مذکورہ بالا حدیث میں قصر ابیض سے مراد مسجد نبوی ہے۔جس وقت آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی تو مسجد نبوی اینٹ کی بجائے گارے اور مٹی کی بنی مسجد تھی آج اگر سیٹلائیٹ (Sattelite) کی مدد سے مسجد کی تصویر لی جائے تو بالکل سفید محل کی طرح نظر آتی ہے۔

قارئین اس حدیث کو پڑھ کر مجھے پورے سیاق و سباق کے ساتھ ایک اور حدیث مبارکہ یاد آ گئی جو حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے آپ ﷺ نے فرمایا'' جب مکہ مکرمہ کا پیٹ چاک کر دیا جائے گا اور اس میں نہروں جیسے راستے نکال دیئے جائیں گے اور مکہ مکرمہ کی عمارتیں اس کے پہاڑوں سے بلند ہو جائیں گی تو سمجھ لو کہ فتنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔

☆ اہل یمن اور اہل شام کے بارے میں یہ حدیث دھیان سے پڑھیئے۔ عبداللہ بن عمرؓ سے '' آپ ﷺ نے فرمایا اے اللہ! ہمارے شام میں برکت عطا فرما، اے اللہ! ہمارے یمن میں برکت عطا فرما۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہمارے بخد میں بھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے اللہ! ہمارے شام میں برکت عطا فرما، اے اللہ! ہمارے یمن میں برکت عطا فرما۔ لوگوں نے پھر کہا یا رسول اللہ ﷺ ہمارے بخد میں بھی؟؟ راوی کا کہنا ہے میرا خیال ہے کہ تیسری بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہاں زلزلے آئیں گے، فتنے برپا ہونگے اور شیطان کا سینگ ظاہر ہوگا۔

☆ حضرت کعبؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب رومی جنگ عظیم (ملاحم میں) اہل شام سے جنگ کریں گے تو اللہ تعالیٰ دو لشکروں کے ذریعہ ان اہل شام کی مدد فرمائے گا ایک مرتبہ ستر ہزار سے دوسری مرتبہ اسی ہزار اہل یمن کے ذریعہ جو اپنی بند تلواریں (پیک اسلحہ) لٹکاتے آئیں گے وہ کہتے ہونگے کہ ہم پکے سچے اللہ کے بندے ہیں ہم اللہ کے دشمنوں سے قتال کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے طاعون، ہر قسم کی تکلیف اور تھکاوٹ کو اٹھا لیں گے حتیٰ کہ شام ملک سے زیادہ ان بیماریوں سے محفوظ کوئی اور ملک نہ ہوگا۔

☆ قارئین آج اگر میڈیا یہ اعلان کر دے کہ فلاں شہر میں سمندری طوفان آنے والا ہے یا فلاں علاقہ تباہ ہونے والا ہے تو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر شہر خالی کر دیا جائے گا اور اس شہر میں ایک کتا تک نظر نہ آئے گا لیکن آقائے نامدار کی احادیث کی روشنی میں ان احادیث کو پڑھ کر کیا کیا احتیاطی تدابیر اختیار کریں؟؟ (مسلسل خاموشی) اب آیئے ملک شام کے متعلق اہم پیشین گوئی:

حضرت ابو داؤدؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا'' جنگ عظیم کے وقت مسلمانوں کا خیمہ (فیلڈ ہیڈ کوارٹر) شام کے شہروں میں سب سے اچھے شہر دمشق کے قریب ''الغوطہ'' کے مقام پر ہوگا۔

شام میں حالیہ قربانیوں کے بعد ہی یہ نوبت آئے گی پیارے قارئین ملک شام کے متعلق مزید احادیث بھی خاصی تفصیل کے ساتھ موجود ہیں جن کو پڑھنے کے لئے آپ کے پاس کتاب کا ہونا لازمی ہے۔ چیدہ چیدہ حصے۔

☆ قیامت قائم ہونے سے پہلے ایسا ضرور ہوگا کہ

نہ میراث تقسیم ہوگی نہ مال غنیمت کی روشنی ہوگی فرمایا شام کے مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے زبردست دشمن جمع ہوکر آئے گا ان سے جنگ کرنے کے لئے مسلمان بھی جمع ہو جائیں گے۔ راوی کہتا ہے میں نے پوچھا دشمن سے آپ ﷺ کی مراد رومی ہیں تو عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا ''ہاں مسلمان اپنی فوج سے ایسی جماعت کا انتخاب کر کے دشمن کے مقابلہ میں بھیجیں گے جس سے طے کریں گے کہ یا مر جائیں گے یا فتح یاب ہونگے چنانچہ دونوں میں لڑائی ہوگی۔ حتیٰ کہ رات دونوں کے درمیان حائل ہوگی اور دونوں فریق اپنی اپنی پناہ گاہوں میں چلے جائیں گے نہ ان کو غلبہ ہو گا نہ وہ غالب آئیں گے اور وہ فدائی دستہ جو آ کے لڑا تھا شہید ہو جائے گا۔ تین دن یہی معاملہ ہوگا چوتھے روز بچے کھچے مسلمان جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہونگے اللہ کافروں کو شکست دے گا اس روز ایسی زبردست جنگ ہوگی کہ اس سے پہلے ایسی جنگ کسی نے نہ دیکھی ہوگی میدان جنگ میں مرنے والوں کی لاشوں کے قریب سے پرندہ گزرنا چاہے گا مگر لاشیں اتنی ہونگی یا ان کی بدبو اتنی ہوگی کہ وہ مر کر گر پڑے گا۔ جنگ میں شریک ہونے والے لوگ اپنے اپنے کنبے کے آدمیوں کا شمار کریں گے تو ایک فیصد میدان جنگ سے بچا ہوگا پھر بتاؤ اس حال میں مال غنیمت لے کر کس کا دل خوش ہوگا کیا ترکہ بانٹنے کو دل چاہے گا''۔

(شام میں کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال اسی کی کڑی ہے)

دجال کا بیان:

متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میری امت کے لئے دجال کے فتنے سے بڑا کوئی فتنہ نہ ہوگا۔''

اس موضوع پر آ کر بہت سی کنفیوژنز پیدا ہوتی ہیں جن کا جواب موجود ہے۔

☆ انس بن مالکؓ سے آپ ﷺ نے فرمایا: دجال کے خروج سے پہلے چند سال دھوکہ فریب کے ہونگے سچے کو جھوٹا اور جھوٹے کو سچا بنایا جائے گا خیانت کرنے والے کو امانت دار بنا دیا جائے گا اور امانت دار کو خیانت کرنے والے قرار دیا جائے گا اور ان میں روبیضہ بات کریں گے پوچھا گیا ''روبیضہ کون''؟ فرمایا گھٹیا لوگ جو لوگوں کے معاملات میں بولا کریں گے (اپنی پارلیمنٹ، ایوان اقتدار کو دیکھ لیں)۔

☆ حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا دجال بائیں آنکھ سے کانا بکھرے بالوں والا ہوگا اس کے ساتھ جنت اور آگ ہوگی بس اس کی آگ درحقیقت جنت ہوگی اور اس کی جنت آگ ہوگی۔

☆ مختلف احادیث سے دجال کے حلئے کی وضاحت کرتے ہوئے دونوں آنکھوں کو عیب دار بتایا

گیا ہے موجودہ دور میں مختلف بڑی کمپنیوں کے نشانات (Logos) میں ایک آنکھ ہوتی ہے۔ کہیں یہ آنکھ سفید ہے جیسے چمکتا ہوا ستارہ کہیں سبز رنگ کی جبکہ ابی بن کعبؓ کی روایت سے بھی پتہ چلتا ہے۔ آپ ﷺ نے دجال کا بیان کرتے ہوئے فرمایا: دجال کی آنکھ شیشے کی مانند سبز ہے۔

☆ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز میں تشہد پڑھ کر فارغ ہو جائے تو اللہ سے چار چیزوں کی پناہ مانگے اور کہے اے اللہ جہنم کے عذاب سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور قبر کے عذاب سے اور موت و حیات کے فتنے سے اور مسیح دجال کے شر سے (مسلم)۔

ایک ٹھنڈی آہ بھر کے اپنی سوچوں کا قبلہ درست کریں یہاں کوئی خاص نماز مراد نہیں ہر نماز کی وہ رکعت جس میں سلام پھیرا جاتا ہے۔ تشہد کے بعد اس دعا کی شمولیت کی تاکید کیوں کی گئی؟؟ اس لیے کہ دجال کا فتنہ عقل کو چکرا دینے والا ہوگا۔ دجال پانی پر کیسے جنگ کرے گا؟ (آج اسرائیل کا اردن، فلسطین، لبنان اور شام کے ساتھ، ترکی کا عراق کے ساتھ اور بھارت کا پاکستان کے ساتھ اسی پانی کا تو تنازعہ ہے) پھر یہ کہ دجال آئے گا تو پانی کا چشمہ لے کر آئے گا سے مراد کون سا چشمہ ہے؟ اس کے آنے پر وقت کیسے تھم جائے گا؟؟ دجال کا معاشی پیکیج کون سا ہوگا؟ اس کی سواری کا راز کس طرح کی جدید سرجری اور ٹیکنالوجی میں چھپا ہو گا؟؟ پھر کچھ مزید احادیث:

☆ عبداللہؓ فرماتے ہیں دجال کے گدھے کے کانوں کے سائے میں ستر ہزار افراد آجائیں گے۔

☆ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: جب دجال اردن میں آئے گا تو وہ طور پہاڑ، تابو پہاڑ اور جودی پہاڑ کو بلائے گا یہاں تک کہ تینوں پہاڑ آپس میں اس طرح ٹکرائیں گے جیسے دو بیل یا مینڈھوں کے سینگ آپس مین ٹکراتے ہیں۔

☆ دجال غذائی مواد کس طرح لے کر آئے گا۔ آج نیسلے سے لے کر کن کن ملٹی نیشنل کمپنیوں کو اس نے غذا کے لئے تیار کیا ہے کس طرح سے زرعی بیجوں کو Patent کروا کے قحط کی صورت حال مٹھی میں رکھی ہے اور عبداللہ ابن مسعودؓ سے ''دجال کے پاس شوربے یا یخنی (سوپ) کا پہاڑ ہوگا اور ایک پہاڑ اس گوشت کا جو ہڈی سے اتار کر کھایا جاتا ہے یہ گرم ہوگا ٹھنڈا نہیں'' کا کیا مطلب ہے ان سب کی تفصیلات اور ہوشربا تفصیلات اس کتاب میں ملتی ہیں۔

کتاب خریدیئے، کتاب پڑھئے اور کتاب پڑھائیے تاکہ علم نافع اور صدقہ جاریہ بن سکے (فی امان اللہ)۔

☆☆☆

میرے دشمنوں کو نوید ہو.....!!

ترقی یافتہ اور مہذب قومیں ہمیشہ تعلیم کو خاص اہمیت دیتی ہیں۔ کیونکہ شعبہ تعلیم کو نظرانداز کرنا گویا مستقبل کو نظرانداز کر دینا ہے۔ لہٰذا محکمہ تعلیم کی بہتری حکومتوں کی اولین ترجیحات میں شامل رہتی ہے۔ دفاع اور معیشت اس وقت تک مضبوط نہیں ہوسکتی جب تک شعبہ تعلیم کا ستون مضبوط نہ ہو..... اگر اسے نظرانداز کیا گیا تو..... باشعور افراد کی کھیپ کیسے تیار ہوگی؟ تعلیم ہی افراد میں صداقت، شجاعت، عدالت اور امامت کی صلاحیت اور شعور پیدا کرتی ہے۔ اگر شعور اور تعلیم نہ ہو تو ترقی کا سفر کیسے جاری رہ سکتا ہے؟ ستاروں سے آگے جہاں کی تلاش کیسے کی جاسکتی ہے! قدم قدم پہ رصدگاہیں کیسے قائم کی جاسکتی ہیں! زراعت وصنعت وحرفت کے میدان میں گھوڑے کیسے دوڑائے جاسکتے ہیں۔ تحقیق اور ایجاد کے شعبوں میں کیسے نام کمایا جاسکتا ہے۔ مغربی اقوام تو تعلیم کو مادی ترقی کے حصول کے لیے استعمال کرتی ہیں اس لیے حصول کو لازمی قرار دیتی ہیں اور اس کے فروغ کے لئے کوشاں رہتی ہیں۔ ہم تو تعلیم سے دونوں جہانوں کے خزانے لوٹ سکتے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے تعلیم کی اہمیت ان سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی لیے علم کے حصول کو ہمارے لیے فرض قرار دیا گیا ہے۔ حکومت یا حکومتی ادارے کی جانب سے نہیں بلکہ اسی خالق ومالک کی جانب سے جو ہم سب کا پروردگار ہے جس نے اپنی تمام مخلوقات میں ہمیں اشرف بنایا ہے، اور یہ اشرافیت علم ہی کی بنیاد پر عطا کی گئی ہے، علم کے بغیر چونکہ ہم منصب انسانیت پر فائز نہیں ہوسکتے۔ اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوسکتے۔ اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ نہیں ہوسکتے۔ دوسروں کے حقوق سے آگاہ نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا انسان کہے جانے کے قابل بھی نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ ہمارے لیے علم کا حاصل کرنا محض لازمی نہیں قرار دیا گیا فرض قرار دیا گیا..... لہٰذا شعبہ تعلیم کی جو اہمیت ہمارے یہاں ہونی چاہیے، وہ آپ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ (مگر آپ کو تو ہر شعبے سے شکایت ہے)

ہمارا مقصد شعبہ تعلیم کے نقائص بیان کرنا نہیں ہے..... کیونکہ تعلیم کے شعبے سے تعلیم یافتہ افراد ہی منسلک ہوں گے اور وہ جو بھی فیصلہ کریں گے قوم ووطن کے مفاد میں ہی کریں گے۔ سو خبر یہ ہے کہ پنجاب بورڈ نے نویں جماعت کے نصاب سے لانس نائیک محفوظ شہید (نشانِ حیدر) اور سوار حسین (نشانِ حیدر) کے اسباق خارج کر دیئے ہیں۔

جب کوئی شخصیت ملکی مفاد کے لئے خطرہ ہوتی ہے تو اسے ملک بدر کردیا جاتا ہے۔ جب کوئی چیز غیرضروری ہوتی ہے تو پھینک دی جاتی ہے۔ جب کوئی چیز مضر ہوجاتی ہے تو اسے قریب نہیں رکھا جاتا.....جس تصویر سے ڈرائنگ روم کا حُسن متاثر ہورہا ہو، وہ تصویر ہٹادی جاتی ہے..... چنانچہ وطن عزیز کے لئے جان کا نذرانہ پیش کرنے والوں اور سب سے بڑا فوجی اعزاز حاصل کرنے والوں کے لئے اب نصاب میں کوئی جگہ نہیں رہی.....(شاید یہ جگہ گلوکاروں، اداکاروں، کھلاڑیوں اور دیگر افراد سے بھری جائے گی) یوں بھی ہمارے ''قومی ہیرو'' کا وہ تصور نہیں ہے جو دیگر باشعور اقوام کا ہوا کرتا ہے۔ ابتدائے عشق میں تو پاکستانی محمد علی، ندیم اور وحید مراد کو قومی ہیروز سمجھتے تھے اور ان پر سو جان سے فدا تھے.....مگر جیسے جیسے حب الوطنی کا نشہ ٹوٹتا گیا۔ پاکستانی ستاروں کی چمک ماند پڑتی گئی اور قومی ہیرو شاہ رخ خان بن گئے.....اب جو بھی ستارہ ہے وہ فلمی ستارہ ہے..... بالی ووڈ کا فلمی ستارہ..... کپڑے ہمارے ستارہ ان کا (یعنی لان ہماری ماڈل ان کی) چائے ہماری چسکا وہ ان کا..... صابن ہمارا شرارہ ان کا .....(بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ صابن ہمارا.....اور میل کچیل دھلیں ان کا) شیمپو ہمارا، زلفیں ان کی..... والٹ بابا کا اس میں تصویر ان کی..... ٹی شرٹ چاچا کی، اس پہ چہرہ ان کا..... بات سکھیوں کی تذکرہ ان کا.....سینما ہال ہمارے، فلمیں ان کی، ریڈیو چینل ہمارے گانے ان کے..... ٹی وی ہمارا..... ڈرامے ان کے ..... ملک ہمارا، ثقافت ان کی..... دکانیں ہماری مصنوعات ان کی.....(امن کی آشا ہماری..... کنٹرول لائن پہ خلاف ورزی ان کی) بس جس طرف آنکھ اٹھائیں یہی تصویراں ہیں.....آنکھیں انہیں دیکھنے، انہیں سراہنے کی عادی ہیں۔ جو میڈیا میں ''اِن'' ہے وہی ہیرو ہے.....وہ کوئی گلوکار ہے..... وہ کوئی فنکار ہے..... وہ کوئی اداکار ہے..... وہ کوئی داغدار ہے..... ہیرو تو وہی ہے..... یہ وطنِ عزیز سے محبت کرنے والے..... یہ وطن عزیز کا دفاع کرنے والے..... یہ وطن عزیز کے لئے جسم پہ زخم کھانے والے..... ہاتھ پاؤں کٹوانے والے، آنکھیں گنوانے والے.....معذور ہونے والے.....جاں کا نذرانہ پیش کرنے والے، تحریک پاکستان کے ہیرو.....1965ء کے ہیرو.....ان کو ہیرو نہ کہو۔ ان کو ہیرو سمجھا تو ہمارے اندر بھی ولولۂ شہادت جوش مارنے لگے گا۔ تمہارے اندر بھی حب الوطنی کا پودا پھوٹ پڑے گا.....تم بھی دفاعِ پاکستان اور بقائے پاکستان کی فکر میں لگ جاؤ گے۔ ان شہداء کو یاد نہ کرو..... ان کے کارنامے نہ پڑھو۔ وطن عزیز کو سب کچھ جاننا، اس پر جان وتن فدا کرنا، محض بے وقوفی ہے۔ یہ تب وتابِ جاویدانہ کا خیال چھوڑ و.....تب وتابِ زندگی دیکھو.....دشمنوں

سے دوستی کرو.....ان سے امن کی آشا رکھو.....ان کی ثقافت اپناؤ.....اپنی زندگی ان کی خوشامد میں گنوا دو۔ ان کے چرنوں میں بیٹھے رہو۔ان کے مقروض اور ان کے ممنون رہو۔ وہ چاہے تمہارے دریاؤں میں پانی چھوڑ دیں یا پانی روک لیں..... چاہے تمہاری پیٹھ میں خنجر گھونپیں.....تم ان کے مصنوعات کی حوصلہ افزائی کرو..... کلچر شو کے نام پر قوم کی بیٹیوں کو نچواؤ..... مقابلہ حسن منعقد کرواؤ..... ان کی زبان سے عشق کرو.....ان کی رسومات کو اپناؤ.....مگر دیکھو! یہ جان! اپنی قیمتی جان جو صرف ایک بار ہی ملتی ہے.....(سات جنم نہیں لیتی ہے)اس جانِ عزیز کو ملکِ عزیز پر قربان نہ کرو..... دیکھو ملک عزیز سے فیض پانے والے..... اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے.....اسے داغدار کرنے والے..... اسے کوڑیوں کے مول بیچنے والے.....اس کا امن وسکون تباہ کرنے والے.....اس کو دہشت گردوں کی آماجگاہ بنانے والے.....اس پر فساد پھیلانے والے..... فساد پھیلانے والوں کی سرپرستی کرنے والے.....اس کی جنت نشاں وادیوں میں بارود کی بو بسانے والے..... اس کی گلیوں میں خونِ ناحق بہانے والے.....کیا اسی ملک پر اپنی جان دیتے ہیں؟؟.....وہ اپنی اس حیاتِ ناپائیدار کے لئے کیسی کیسی بداعمالیاں.....کیسی کیسی بدعنوانیاں.....کیسی کیسی لن ترانیاں..... کیسی کیسی ناعاقبت اندیشیاں کرتے ہیں۔ اور تم ہو کہ میجر عزیز، راشد منہاس، محمد محفوظ اور سوار حسین کو اپنا آئیڈیل بنانا چاہتے ہو.....تم پاکستان کے جری پاسبانوں کے کارنامے یاد رکھنا چاہتے ہو.....تم شہداء پاکستان کی یاد تازہ رکھنا چاہتے ہو،انہیں یاد کرو گے تو دشمنوں کا تذکرہ بھی آئے گا۔اور دوستی کی آشا میں دشمنی کو یاد رکھنا مہذب قوموں کو زیب نہیں دیتا..... نکلو ان دشمنیوں..... لڑائیوں..... اس ہیروازم سے.....!!

☆☆☆

شہزادی چاند سلطان (چاند بی بی)

چاند بی بی کا نام تاریخ میں بہادر، شیر دل اور جنگجو خاتون کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان کی ریاست احمد نگر (دکن) کے والی حسین نظام شاہ کی بیٹی اور سلطان برھان الملک کی بہن تھی۔ اس کی ماں کا نام خونزہ ہمایوں تھا۔ اس کے والدین نے اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی اور شاہی خاندان کے دستور کے مطابق نہایت قابل اور لائق اساتذہ کو اس کی تعلیم و تربیت پر مامور کیا تھا۔ چند ہی سالوں میں شہزادی علم و فن کے میدان میں اپنی قابلیت کا لوہا منوانے لگی۔ خود بادشاہ چاند بی بی کو سپہ گری، شہ سواری، شمشیر زنی اور نیزہ بازی کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اور ملکی نظم و نسق کے امور بھی سمجھایا کرتا تھا۔ دیگر علوم کے ساتھ ساتھ شہزادی کو مصوری کا بھی شوق تھا وہ پھولوں کی تصاویر بنایا کرتی تھی۔ اس وقت تخت دہلی پر مغل بادشاہ اکبر کی حکمرانی تھی اور احمد نگر دکن پر حسین نظام شاہ کی حکومت تھی۔ یہ واقعات 1550ء سے 1599ء کے درمیان پیش آئے۔

شہزادی جب جوان ہوئی تو اس کی فہم و دانش، علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ اس کی دیگر خوبیوں کی شہرت، چہار عالم میں پھیل گئی۔ جب اس کے اوصاف حمیدہ کے بارے میں بیجا پور کے حکمران علی عادل شاہ نے سنا تو اس نے حسین نظام شاہ کو چاند بی بی کے لئے پیغام بھیجا جسے اس نے منظور کرلیا اور یوں چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے ہوگئی۔ علی عادل شاہ سے شادی کی دیگر وجوہات بھی تھیں۔

مسلمان حکمران آپس کی ریشہ دوانیوں اور خانہ جنگیوں سے کمزور ہو چکے تھے دکن کی ریاست کئی حکمرانوں میں بٹ گئی تھی۔ مصطفیٰ خان اردستانی صحیح النسب سید اور حکومت کا عظیم المرتبت فرد تھا اس نے احمد نگر کے حکمران حسین نظام شاہ اور بیجا پور کے حکمران علی عادل شاہ سے الگ الگ ملاقاتیں کیں اور انھیں کہا کہ دانش مندی اسی میں ہے کہ تمام مسلمان فرمانروا ایک دوسرے کے دوست بن کر رہیں، باہمی اتفاق و اتحاد سے کام لیں تاکہ مل کر دشمنوں پر پوری قوت کے ساتھ نبرد آزما ہوں۔ یہ تجویز دونوں کو پسند آئی۔ دونوں نے اپنے امراء کے ساتھ مل کر طویل بات چیت کی اور دونوں سلطنتوں میں قربت کا جائزہ لیا۔ ان لوگوں نے آپس میں مل کر طے کیا حسین نظام شاہ اپنی بیٹی چاند بی بی کی شادی سلطان علی عادل شاہ سے کر دیں اور اپنی بیٹی کو جہیز میں شولا پور کا قلعہ دے۔ اسی طرح علی عادل

شاہ اپنی بہن ہدیہ سلطان کو حسین نظام شاہ کے بیٹے شہزادہ مرتضٰی سے بیاہ دے یوں دونوں فرمانرواؤں کے تعلقات بہتر ہو جائیں گے اور یہ سب مل کر سرکش ہندوؤں پر حملہ کریں اور ان کی بداعمالیوں کی سخت سزا دیں۔

ایک ہی دن دونوں طرف شادی کی محفلیں آراستہ کی گئیں۔ چاند بی بی بیجاپور آ گئی اور ہدیہ سلطان کو احمد نگر روانہ کر دیا گیا۔ یہ شادیاں نہایت دھوم دھام سے ہوئیں طرفین نے خوب جی کھول کر جشن مسرت منعقد کیئے۔

بیجاپور پہنچ کر چاند بی بی نے اپنی سلیقہ شعاری اور حسن لیاقت سے سسرال والوں کے دل مٹھی میں کر لیے۔ ساتھ ہی اپنی رعایا اور زیردستوں سے ایسا اچھا برتاؤ کیا کہ سب اس کے گن گانے لگے۔

ایک دفعہ علی عادل کو خبر ملی کہ دربار کے کچھ امیر اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں اور اس کی جان لینے کے درپے ہیں۔ اس نے ان امیروں کے نام معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اب وہ ہر وقت اپنی جان کے خوف سے متفکر رہنے لگا۔ چاند بی بی نے شوہر کی یہ حالت دیکھی تو اس نے بڑے اصرار سے بادشاہ سے اس کا سبب دریافت کیا۔ جب اس نے بتایا کہ مجھے قتل کرنے کی سازش ہو رہی ہے تو بہادر چاند بی بی نے شوہر کو تسلی دی اور کہا کہ میرے جیتے جی آپ کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ آج سے رات کو میں آپ کی حفاظت کیا کروں گی۔ آپ اطمینان سے سویا کیجئے۔

چنانچہ اس دن سے چاند بی بی بذات خود شاہی خواب گاہ کی نگرانی کرنے لگی۔ ایک رات کسی کے یکا یک بالا خانے پر کودنے کی آواز آئی۔ وہ پہرے داروں کو آواز دینے یا شوہر کو جگانے کی بجائے تن تنہا تلوار سونت کر بالا خانے پر چڑھ گئی۔ وہاں دو نقاب پوش ہاتھوں میں برہنہ تلواریں لیے کھڑے تھے۔ وہ دونوں چاند بی بی پر جھپٹے مگر وہ پھرتی سے پیچھے ہٹی اور پینترا بدل کر تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ ایک تو وہیں ڈھیر ہو گیا دوسرا آگے بڑھا تو اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ شور سن کر علی عادل شاہ بھی جاگ اٹھا اور دوڑتا ہوا اوپر آیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو اپنی بہادر ملکہ کی تلوار چوم لی اور بولا چاند بیگم اگر تمام دنیا بھی میری دشمن ہو جائے تو تیرے ہوتے ہوئے مجھے کوئی ڈر نہیں"۔

ایک مرتبہ وہ پالکی میں سوار میکہ احمد نگر سے سسرال بیجاپور جا رہی تھی۔ چند مسلح سپاہی بھی ساتھ تھے۔ راستے میں ایک ویران مقام پر ڈاکوؤں کے ایک بڑے جتھے نے اس چھوٹے سے قافلے پر حملہ کر دیا۔ محافظ سپاہیوں نے جی توڑ کر ان کا مقابلہ کیا لیکن سب ایک ایک کر کے مارے گئے اور ملکہ چاند بی بی اکیلی رہ گئی۔ ان حالات میں وہ ذرا بھی نہ گھبرائی بلکہ بڑی بہادری سے تلوار سونت کر پالکی سے اتری اور ڈاکوؤں کا بڑی بے جگری

سے مقابلہ کیا۔ بہت سے اس کی تلوار کا لقمہ بن گئے اور باقی بھاگ گئے۔

چاند بی بی کی کوئی اولاد نہ تھی تو اس کے شوہر علی عادل شاہ نے اپنے بھائی کے بیٹے ابراہیم بن طماسپ کو ماہ شوال ۹۸۷ھ میں اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ اسی مہینہ شہزادے ابراہیم کی رسم ختنہ عمل میں آئی اور ایک بہت بڑا جشن مسرت منعقد ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ جس روز یہ جشن ہوا اسی روز رسم کے مطابق رات کے وقت شہزادے کو سرخ لباس پہنا کر شہر میں پھرایا گیا۔ شہر کی سڑکوں پر دونوں طرف آتش بازی کے درخت اور گولے آویزاں کیے گئے۔ اتفاق سے بارود میں آگ لگ گئی۔ جس کی وجہ سے سات سو آدمی مارے گئے لیکن اللہ کے کرم سے شہزادے کو کوئی نقصان نہ پہنچا اور وہ بچ گیا۔ علی عادل شاہ بہت ہی عالی ظرف انسان تھا۔ ہر خاص و عام کو اپنے لطف و کرم سے خوش رکھتا۔ اس کا عہد حکومت سبھی کے لئے باعث خیر و برکت تھا۔ لیکن بادشاہوں کے دشمن ہر وقت ان کی تاک میں ہوتے ہیں جو موقعہ پا کر اپنی چال میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ایک رات ۲۳ صفر ۹۸۹ھ کو ایک خواجہ سرا نے علی عادل شاہ کو قتل کر دیا۔ ملا رضائی مشہدی نے علی عادل شاہ کا بہت ہی غم انگیز اور جان گداز مرثیہ لکھا ملک کے تمام امیر جملہ ارا کین سلطنت اس سانحہ دل شکن سے بے حد افسردہ ہوئے۔ بادشاہ کو شہر کے اندر ایک نمایاں جگہ پر دفن کیا گیا۔ اس کا مزار اب ''روضہ علی'' کے نام سے مشہور ہے۔

عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق چاند بی بی ابراہیم کی سرپرست مقرر ہوئی اور ابراہیم عادل شاہ مسند حکومت پر جلوہ افروز ہوا۔ اگر چہ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر صرف دس سال تھی لیکن اس کی ذہنی صلاحیت عمر کے لحاظ سے کہیں زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے تمام ارا کین سلطنت کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنا بنا لیا۔ درباریوں نے بادشاہ پر روپے اور اشرفیاں نچھاور کیں بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ دکانداروں نے اپنی دکانوں کو طرح طرح کے ریشمی کپڑوں سے آراستہ کیا۔ ہندوستان کے دستور کے مطابق مٹی کے برتنوں میں روپے بھر بھر کر بادشاہ پر نچھاور کیے گئے۔

عادل شاہ کا ایک خاص امیر کامل خان دکنی تمام ملکی و سیاسی امور کا مختار ہو گیا۔ اس نے اپنے اعتباری مقربین کو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے گرد مقرر کیا۔ قلعے کے تھانیدار کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس نے بادشاہ کی تعلیم و تربیت کا فریضہ علی عادل شاہ کی وصیت کے مطابق اس کی بیوی چاند بی بی کے سپرد کیا۔ بدھ اور جمعہ کے علاوہ ہر روز وہ ابراہیم کو شاہی محل سے نکال کر دربار میں لاتا اور تمام لوگوں کو بادشاہ کے حضور آنے کا

موقع دیتا۔لیکن کچھ عرصہ کے بعد کامل خان کے دماغ پر اقتدار کا نشہ چڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ چاند بی بی کے احکامات کو رد کرنے لگا اور اس کے ساتھ بے ادبی سے پیش آنے لگا۔ چاند بی بی اس کی یہ حرکات برداشت نہ کرسکی اس نے غصہ میں آکر حاجی کشور خان ولد کمال خان جو عادل شاہ کا وزیر اور سفیر رہ چکا تھا کو پیغام بھیجا کہ کامل خان اب اس منصب کے اہل نہیں رہا اب تم آکر یہ منصب سنبھالو۔کشور خان چار سو مسلح افراد کے ساتھ سبز محل کی طرف روانہ ہوا کامل خان کو جب اس کے آنے کی اطلاع ملی اور اس نے جان لیا کہ یہ چاند بی بی کے کہنے پر آیا ہے تو اس نے مزاحمت نہ کی اور قلعے کی پچھلی دیوار سے کود کر فرار ہوگیا۔

اس واقعہ کے بعد چاند بی بی نے تمام امور سلطنت حاجی کشور خان کے ہاتھ میں دے دیے۔ کچھ عرصہ بعد حاجی کشور خان نے چاند بی بی پر بغاوت کا الزام لگا کر اسے قلعہ ستارا میں نظر بند کر دیا۔ بعد میں اندرونی سازشوں کی وجہ سے کشور خان مارا گیا اور یوں چاند بی بی قلعہ ستارا سے محل واپس آ گئی۔

امیروں اور وزیروں کی سازشوں سے تنگ آ کر چاند بی بی احمد نگر واپس چلی گئی۔اس کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد سازشی وزیروں میں پھوٹ پڑ گئی ۔ ابراہیم عادل شاہ نے ان کی نا اتفاقی کا فائدہ اٹھا کر سب کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا اور چاند بی بی کو واپس بلا بھیجا۔ وہ بیجا نگر آ تو گئی لیکن اس کا دل مردہ ہو چکا تھا اور وہ سیاسی جھمیلوں سے الگ رہ کر پر سکون زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

چاند بی بی کے والد حسین نظام شاہ نے ۹۷۲ھ/ ۱۵۶۵ء میں وفات پائی تو مرتضٰی نظام شاہ اپنی ماں خونزہ ہمایوں کی سر پرستی میں باپ کی جگہ مسند حکومت پر بیٹھا۔ چھ سال تک تو ماں کاروبار حکومت چلاتی رہی اس کے بعد وزیروں نے اقتدار اس سے چھین کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔مرتضٰی نظام شاہ محض نام کا بادشاہ تھا اور دیوانہ کہلاتا تھا۔

۱۵۸۸ء میں اس کی وفات کے بعد شہزادے میراں حسین، اسماعیل اور برہان شاہ (ثانی) یکے بعد دیگرے تختِ حکومت پر بیٹھے۔ برہان شاہ جو حسین نظام کا بیٹا اور چاند بی بی کا بھائی تھا کے دور حکومت میں مغل بادشاہ اکبر نے شہزادہ مراد اور خان خاناں کو تسخیر دکن کے لئے روانہ کیا۔ برہان شاہ نے ان کو اپنی مملکت کے ایک صوبے برار کی پیش کش کر دی لیکن ابھی یہ معاملہ پوری طرح طے نہیں ہوا تھا کہ برہان شاہ فوت ہوگیا۔ اس کی جگہ ابراہیم شاہ تخت نشین ہوا وہ بھی جلد باغی امراء کے ہاتھوں مارا گیا۔اب تین امراء میں تخت نشینی کے لئے کشمکش شروع ہوگئی اور مملکت کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

چاند بی بی کو اس صورت حال کا علم ہوا تو وہ بیجا پور

سے احمد نگر آ گئی، اس اثناء میں شہزادہ مراد اور خان خاناں یلغار کرتے ہوئے احمد نگر کے قریب آ پہنچے۔ چاند بی بی نے تہیہ کر لیا کہ وہ ہر صورت میں اپنی آبائی حکومت کو بچائے گی۔ اس نے پہلے تو مخالفت امراء کو قلعہ سے باہر نکال دیا اور باقی کو حسن تدبیر سے اپنے ساتھ ملا لیا۔ پھر اس نے محمد علی قطب شاہ والی گولکنڈہ اور ابراہیم عادل شاہ ولی بیجاپور سے امداد طلب کی اور قلعہ کے حفاظتی انتظامات کو مستحکم کر کے شہزادہ مراد کو خط لکھا کہ اگر آپ دوست کی حیثیت سے احمد نگر آنا چاہتے ہیں تو بڑی خوشی سے تشریف لائیں۔ آپ ہمیں حد سے زیادہ مہمان نواز پائیں گے لیکن اگر آپ کا ارادہ احمد نگر پر بزور شمشیر قبضہ کرنے کا ہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ احمد نگر کا بچہ بچہ اپنے وطن کی حرمت پر قربان ہو جائے گا اور اپنے جیتے جی کسی کو اپنی سرزمین پر قدم نہیں رکھنے دے گا۔

شہزادہ مراد نے اس تنبیہ کی کچھ پرواہ نہ کی اور ۱۵۹۵ء کو اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ احمد نگر کی طرف بڑھا۔ چاند بی بی کی فوج نے اس کی ذاتی نگرانی میں مغل فوج پر اپنی توپوں سے ایسی شدید گولہ باری کی کہ حملہ آور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔ دوسرے دن مراد نے خان خاناں اور دوسرے سرداران فوج سے مشورہ کرنے کے بعد چاروں طرف سے قلعہ کا محاصرہ کر لیا یہ محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران مغل فوج نے کئی بار بڑے جوش وخروش سے قلعے پر حملے کیے مگر ہر بار منہ کی کھائی۔

ادھر چاند بی بی کی درخواست پر ابراہیم عادل شاہ نے پچیس ہزار سوار اور قطب شاہ نے پانچ چھ ہزار سوار اور کچھ پیادے چاند بی بی کی مدد کے لئے روانہ کیے۔ شہزادہ مراد کو اس لشکر کے روانہ ہونے کی اطلاع ملی تو اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ امدادی لشکر کے پہنچے سے پہلے قلعہ پر ہر صورت میں قبضہ کرنے کی کوشش کرو۔ چنانچہ قلعہ کے برج تک پانچ سرنگیں کھودی گئیں اور ان میں بارود بھر دی گئی تا کہ اسے آگ لگا کر قلعہ کو اڑا دیا جائے، مگر چاند بی بی غافل نہیں بیٹھی تھی اسے ان سرنگوں کا علم ہوا تو راتوں رات سرنگوں میں پانی بھروانہ شروع کر دیا۔ ابھی دو یا تین سرنگیں بیکار ہوئی تھیں کہ شہزادہ مراد نے سرنگوں کو آگ لگانے کا حکم دے دیا۔ اس زور کا دھماکہ ہوا کہ کانوں کے پردے پھٹ گئے اور قلعے کی دیوار میں پچاس گز چوڑا شگاف پڑ گیا۔ قلعے میں محصور سپاہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے لیکن بہادر چاند بی بی ذرا نہ گھبرائی اور گھوڑے پر سوار ہاتھوں میں علم لئے سراپردہ سے باہر نکل آئی۔ اور اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ زیادہ سے زیادہ توپوں کو گھسیٹ کر شگاف میں کھڑی کر دو۔ فوج نے اسی کے مطابق عمل کیا اور پھر مغل فوج پر بے پناہ گولہ باری شروع کر دی۔ حملہ آور فوج نے آگے بڑھنے کی سرتوڑ کوشش کی اور بار بار قلعے پر خوفناک حملے کیے لیکن چاند بی بی نے اسے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے

دیا۔ وہ اسی ہمت اور استقلال سے اپنی فوج کولڑاتی رہی کہ شام تک قلعہ کی خندق حملہ آور سپاہیوں کی لاشوں سے پٹ گئی اور شہزادہ مراد کو مایوس ہوکر پیچھے ہٹنا پڑا۔

ایک موقع پر چاند بی بی کی فوج کے پاس سیسہ کی گولیاں ختم ہوگئیں اس نے فوراً تانبے کی گولیاں ڈھالنے کا حکم دیا۔ جب وہ بھی ختم ہوگئیں تو سونے چاندی کی گولیاں تیار کروائیں اور اس مقصد کے لئے شاہی حرم سرا کے طلائی ونقرئی برتن، زیورات، ہزاروں طلائی اور نقرئی روپے فوج کے حوالے کردیے مگر شکست قبول نہ کی۔

رات کو چاند بی بی نے اپنی نگرانی میں گری ہوئی دیوار کو دوبارہ بنوا دیا چھوٹے بڑے سبھی حتیٰ کہ عورتیں بھی دیوار بناتی رہیں۔ اس کو پہلے سے تین گز بلند کردیا، صبح کو شہزادہ مراد نے دیکھا تو شگاف کی جگہ پہلے سے بھی بلند دیوار اس کے راستے میں حائل تھی۔

موافق اور مخالف دونوں کے منہ سے چاند خاتون کی اس اوالعزمی استقلال اور بہادری پر صدائے تحسین بلند ہوگئی اور اسی وقت سے چاند بی بی کا لقب ''چاند سلطان'' ہوگیا۔ اس ناکامی سے شہزادہ سلطان کا دل چھوٹ گیا۔

شہزادہ سلطان اور اہل قلعہ دونوں ہی کی طرف سے کچھ آدمی درمیان میں پڑے اور طرفین میں اس شرط پر صلح ہوئی کہ حسب قرار برار کا صوبہ شہزادہ مراد کے حوالے کردیا۔

شہزادہ مراد کی واپسی کے بعد چار سال تک احمد نگر کے لوگ امن چین سے زندگی بسر کرتے رہے لیکن پھر امراء میں خودغرضی اور نااتفاقی نے سر ابھارا۔ اکبر اسی موقع کی تاک میں تھا اس نے ۱۵۹۹ء میں شہزادہ دانیال کی سرکردگی میں ایک جرار لشکر احمد نگر کی تسخیر کے لئے بھیج دیا۔

اب کی بار مغل شاہی فوج کا پلّہ بھاری تھا کیونکہ احمد نگر کی طاقت کو خانہ جنگیوں نے کمزور کردیا تھا۔ تاہم چاند سلطانہ اپنے جان نثاروں کو لے کر مقابلہ کیلئے کمر بستہ ہوگئی۔ اس نازک گھڑی میں چیتہ خان، خواجہ سرا اور بعض دوسرے امیروں نے غداری کی۔ انہوں نے فوج کے سپاہیوں کو یہ کہہ کر ملکہ کے خلاف بھڑکایا کہ وہ تم سے دغا کررہی ہے اور قلعہ کو دشمنوں کے حوالے کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ مشتعل سپاہی ان غداروں کے ساتھ چاند سلطانہ کے کمرے میں گھس گئے اور اس کو قتل کرڈالا اور یوں اس بہادر خاتون کی زندگی کا افسوسناک طریقے سے خاتمہ ہوگیا۔

(استفادہ: تاریخ فرشتہ از محمد قاسم فرشتہ، چار سو باکمال خواتین از طالب ہاشمی، انٹرنیٹ)

☆☆☆

جسے چاہا در پہ بلا لیا

مجھ ناچیز کو یہ عظیم سعادت حاصل ہوئی جیسے میں نے جاگتی آنکھوں کوئی خواب دیکھا۔ ہمیشہ یہی خیال رہا کہ حج میری استطاعت میں نہیں۔ ابھی تو خاندان کے بہت سے بزرگ، نیک اور پرہیز گار بندے اس لائن میں کھڑے ہیں۔ ابھی میری عبادتیں اس پیمانے پر پوری نہیں اتریں لیکن جب اللہ نے اپنے در پر حاضری کے لئے بلایا تو دل میں یقین پختہ ہوگیا کہ نیکی و بدی، خلوص اور نیک نیتی کے تمام پیمانے درحقیقت اس رب کے ہاتھ میں ہیں جس نے مجھے نوازا ہے۔

جسم میں کپکپی ، خوف اور آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے دعائیں کررہی ہوں، اے میرے رب! تُو جس نے مجھے میرے اصلی روپ میں دیکھا ہے، میرے اندر سے واقف ہے، میرا ہمراز ہے، میرے سینے میں چھپے ہوئے تمام احساسات اور رازوں سے واقف ہے، میری شہ رگ سے بھی قریب ہے، اپنے بندوں کے عیوب چھپانے والی ہستی، مجھے اس زمین کے ٹکڑے پر قدم رکھنے سے پہلے معاف فرمادے جو تیرے مقدس گھر اور تیرے محبوب نبی حضرت محمدؐ سے منسوب ہے تاکہ میں اس پاک شہر اور پاک گھر میں داخل ہوں تو کسی بھی قسم کی شرمندگی کا احساس دل میں نہ ہو کیونکہ ہم کسی سے ملاقات کو جائیں اور شرمندہ ہوں تو اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتے!

خوش نصیبی زمین کے اس ٹکڑے کی کہ جس میں نبی پاکؐ کے قدموں کے نشانات ہوں گے، ہواؤں نے آپؐ کی خوشبوؤں کو سینے میں اتارا ہوگا، شجر وحجر نے آپؐ کی زیارت کی ہوگی۔ آخر کار وہ وقت آن پہنچا جو نہ کبھی زندگی میں آیا اور نہ کبھی آئے گا، وہ مقدس گھر، جس کو تصویروں میں دیکھا تھا، تصور میں سوچا تھا، میرے تصورات سے بھی بڑھ کر نور میں نہایا ہوا، رب کی رحمتوں سے جل تھل، اردگرد سے بے نیاز کردینے والا، میرے سامنے تھا، محسوس ہوا کہ اب تک جتنی خوبصورتیاں اور نظارے دیکھے ہیں وہ سب ہیچ ہیں، محسوس ہوا کہ یہ زندگی کا آغاز ہے اور دل نے کہا کہ انجام بھی یہیں ہوجائے!

تمام خوف ہوا ہوگئے، ماں کو بیٹے، بیٹے کو ماں، خاوند کو بیوی اور بیوی کو خاوند، بھائی کو بہن اور بہن کو بھائی یاد نہ رہا۔ سب کے سب اپنے اپنے واسطے سے صرف ایک ہی رشتے سے جڑے ہوئے تھے۔ بندہ اور رب، رب اور بندہ، سب کچھ اپنا اپنا سا تھا۔ محسوس ہوا کہ صرف میں ہوں اور میرا رب خود موجود ہے۔

جب خانۂ خدا سامنے ہو، رب کا دربار بھی ہو، دل گلوگیر بھی ہو، عاجزی بھی ہو تو تمام باتیں دعائیں بن کر زبان پر مچل جاتی ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری وساری رہے۔ اپنے لیے جو مانگنا تھا وہ مانگا اور جس جس نے پاکستان سے دعاؤں کا کہا تھا استدعا کی کہ اے میرے رب! مجھے ان کی زبان بنادے۔ میری حاضری کو ان کی حاضری سمجھ لے اور ان کی بھیجی ہوئی دعاؤں کو قبول فرمالے۔ (آمین) کافی دیر اپنے رب سے ہم کلام رہی۔ اس پختہ یقین کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام دعائیں قبول کرلی ہیں۔ یہ لمحات میری خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل کے اور ان دیکھے خوابوں کی تعمیر کے لمحات تھے!

بندے کے ایمان کو مضبوط کرنے کے لیے تو یہ بات بھی بہت بڑی ہے کہ دنیا کے ہر خطے کے انسان جو ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں، اپنے اللہ سے اپنا رشتہ جوڑنے کے لیے ایک ہی در پر حاضر ہیں، سب کے سجدہ ریز ہونے کا رخ ایک ہی طرف ہے، سب کا مخاطب ایک ہی ہے!

میری نند اور ساس ہمراہ تھیں، تہجد کے نوافل ادا کرنے کے لیے ہم تینوں خواتین ایک جگہ اکٹھی ہوئیں۔ آصف قدرے فاصلے پر تھے۔ تہجد اور فجر ادا کرنے کے بعد تھکن اپنے تمام تر ہتھیاروں کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہوگئی اور گزشتہ تین دن کی بے آرامی نے اپنا رنگ دکھانا شروع کردیا۔ قدموں پر کھڑا رہنا دوبھر ہوگیا اور آنکھیں تھیں کہ بند ہوئی جاتی تھیں، ہمت نے جواب دینا شروع کردیا لیکن اللہ بھلا کرے فرزانہ باجی کا، جنہوں نے ہم تینوں کی ہمت بندھائی اور کہا کہ عمرہ کرکے ہی رہائش پر چلیں گے تاکہ احرام وغیرہ تبدیل کرکے آرام سے سوئیں گے لہٰذا صبح سات اور آٹھ کے درمیان عمرہ ادا کرنے کی نیت باندھی۔ یہ وہ عمرہ ہے جس کا احرام ہم نے پاکستان سے باندھا۔ طواف کی نیت کی اور خانۂ کعبہ کے چکر لگانے شروع کیے۔ جوں جوں ہم چلتی تھیں، لگتا تھا کہ کوئی کشش اللہ کے گھر کی طرف کھینچ رہی ہے۔ ہم چاروں افراد ایک دوسرے کی ہمراہی میں خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگاتے رہے آخری چکر میں رکنِ یمانی سے پہلے والی دیوار پر جگہ مل گئی اور میں اس سے چمٹ گئی۔ طواف پورے کرنے کے بعد مقام ابراہیم کے دو نفل ادا کیے۔ حضرت ابراہیمؑ کے پایۂ مبارک کے نشانات نہ بہت بڑے اور نہ بہت چھوٹے تھے بلکہ درمیانے چوڑے، اس جنت کے پتھر میں تقریباً 6,6 انچ دھنسے ہوئے تھے روایات ہیں کہ جوں جوں تعمیر کے وقت خانۂ کعبہ کی دیواریں بلند ہوتی تھیں، یہ پتھر خود بخود آگے پیچھے اور اوپر نیچے ہوتا تھا.....اس کا رنگ ہماری زمینی مٹی جیسا نہ تھا بلکہ سرخی مائل بھورا تھا۔ پھر سیر ہوکے آبِ زم زم پیا، وہ آبِ زم زم جسے ہم قطروں اور گھونٹوں کے حساب

سے پیتے تھے، بے حساب پیا، ہاتھوں اور پیروں پر ڈالا اور سعی کے لیے بابِ صفا کی طرف چلے، سعی کی نیت کی۔ ملائم، پھسلوان فرش پر قدم جلدی جلدی اٹھانے کا یارانہ تھا۔ سعی کے سات چکر صفا اور مروہ کے درمیان پورے کیے۔ ایک ایک پور برابر بال کاٹے، اب ہم احرام کی پابندیوں سے آزاد تھے لہٰذا آرام کی غرض سے لیٹ گئے، جب اٹھے تو چلنے کے قابل نہ تھے بلکہ محسوس ہو رہا تھا کہ ٹانگوں میں لکڑیاں ڈال دی گئی ہیں، قدم زمین پر ٹکتے نہ تھے اور جسم کا بوجھ اٹھانے سے یکسر انکاری لیکن اس تمام تکلیف اور بے آرامی کے باوجود دل اپنی قسمت پر نازاں، اللہ کی رحمت پر شکر گزار، خوشی سے سرشار.....

یہاں مجھے زندگی کا پہلا جمعہ، جماعت سے پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ بھی خانۂ کعبہ میں قاری عبدالرحمٰن السُدیس کی آواز میں۔ خطبہ عربی میں ہونے کے باوجود (جو ہمیں سمجھ بھی نہیں آ رہا تھا) دل میں اترتا جا رہا تھا، دل چاہا ایسے لمحوں کا حصہ بن جاؤں اور ایسے بہت سے جمعے، اے میرے پاک پروردگار، میرے نصیب میں لکھ دے! ارادہ کیا کہ انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ دوبارہ بلائے گا تو تھوڑی بہت عربی اور اس کا ترجمہ سیکھ کر آئیں گے۔ کیونکہ جو سمجھ میں نہ آنے کے باوجود اتنا لطف دے رہا ہے تو جن کی سمجھ میں آ رہا ہوگا، ان کا کیا حال ہوگا!

آصف ہم سب کا خصوصاً اپنی والدہ کا بہت خیال رکھتے ہیں، جس طرح ایک فرمانبردار اور صالح بیٹے کو رکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ان کو جزا دے اور سب کے بیٹوں کو ایسا فرمانبردار بنا دے۔ ان کی والدہ نے شکایت کی تھی کہ مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے، لہٰذا انہوں نے الیکٹرک کیٹل اور چائے کا تمام جملہ سامان لا کر رکھ دیا کہ جس وقت چاہیں، چائے بنا کر پئیں۔ اس کے علاوہ رہائش پر ہر وقت پھل فروٹ، ڈبل روٹی، کریم، مکھن، بند، کھجوریں اور سوکھا میوہ موجود رہتا، پینے کے لیے آبِ زم زم ہوتا ہے کیونکہ یہاں روزانہ ایک لیٹر، فی فرد زم زم، کمرے میں پہنچایا جاتا ہے۔

اب ہمیں یہاں پہنچے ساتواں دن ہو گیا، نمازِ ظہر کے بعد اپنے بچوں تحریم، فرغام کے لیے طواف ادا کیے اور حیرت انگیز طور پر کسی بھی قسم کی تھکن کا احساس تک نہ ہوا، یوں لگا یہ طواف پھولوں پر ادا کیے ہیں۔ مجھے اپنے بچے اور گھر بے انتہا یاد آئے لیکن ایک سکون، خوبصورت اطمینان بخش ٹھنڈک نے دل کو اسیر کیے رکھا۔ نہ صرف اپنے بچوں بلکہ شہر کے لئے بھی بہت زیادہ دعائیں کرتی ہوں کیونکہ وہ بھی تو آج کل میرے بچوں کے ساتھ ہی رہ رہا ہے۔

طواف کرتے ہوئے جب افریقیوں پر نظر پڑتی تو سوچتی کہ حضرت بلالؓ بھی تو اسی رنگ و نسل سے تعلق رکھتے تھے، سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ جب حضرت

بلالؓ ہمارے نبی پاک ﷺ کو اتنے پسند تھے تو یہاں دیوانہ وار پھرتے یہ حبشی ہمیں کیسے برے لگ سکتے ہیں! شاید اللہ تعالیٰ نے اسی پسند اور محبت کی کچھ بوندیں ہمارے دامنوں میں بھی ٹپکا دی ہیں۔ ان افریقیوں کے طوافوں میں بڑی شدت ہے، یوں لگتا ہے کہ کوئی دیوار بھی ان کے راستے میں آ گئی تو گرا دیں گے۔

حرم شریف کی ہر چیز میں خوبصورتی کی انتہا ہے، ہر شے پاکیزہ اور دھلی دھلی دکھائی دیتی ہے اور رات کو تو خاص طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نور کی بارش ہو رہی ہے، سبحان اللہ!

انسانی زندگی میں ایک موت کا خوف، ایسا ہوتا ہے جو ہر خوف پر بھاری ہوتا ہے لیکن یہاں آ کے تو موت کا خوف بھی محسوس نہیں ہوتا بلکہ یہ سعادت کی بات ہوگی اگر ہم یہاں پر مر گئے۔

رہائش پر نوٹس چسپاں کئے جا چکے تھے کہ ۸ ذوالحج کی رات ایک بجے منیٰ روانگی ہے اور حج کے ارکان کی شروعات ہو جائے گی، خواب کا سا گمان گزرا۔ نماز عشاء کے بعد وضو کیا، احرام باندھا اور دو نفل احرام کے ادا کرنے کے لیے فرزانہ باجی اور آصف کی معیت میں حرم کی طرف روانہ ہوئے کہ ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آ گیا۔ ہم لوگ کمرے سے نکل کر لفٹ تک آئے تو ملازم نے بتایا کہ یہ لفٹ خراب ہے لہٰذا آپ کو سیڑھیوں سے جانا پڑے گا، ہمارا کمرہ نویں منزل پر تھا لہٰذا ہم نے ہمت باندھی اور اترنا شروع کیا، تیسری منزل پر پہنچے تو دوسری لفٹ کھڑی مل گئی، اس میں سوار ہوئے تو لفٹ بند ہوگئی، دروازہ کھلا تو آگے دیوار تھی۔ ہم درمیان میں کہیں پھنس چکے تھے۔ ہم سات لوگ ایک دوسرے سے تقریباً جڑے کھڑے تھے۔ پانچ منٹ کے بعد آکسیجن کی کمی کا احساس ہوا تو عورتوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ فون کرنے پر معلوم ہوا کہ آپریٹر ٹھیک کر رہا ہے۔ میرے توجہ دلانے پر سب کلمہ پڑھنے لگے۔ لیکن میں بالکل مطمئن تھی۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ میرے اعصاب اتنے مضبوط ہوں گے، میں سوچ رہی تھی کہ اگر اس وقت ہم مر بھی گئے تو موت کتنی خوب صورت ہوگی جسم پر احرام، زبانوں پر کلمہ، روح اور جسم و ذہن بالکل پاک وصاف، سفر حرم شریف کی جانب اور نیت حج کی (ماشاءاللہ)۔ خیر اللہ نے کرم کیا اور تقریباً پندرہ منٹ بعد لفٹ ٹھیک ہوگئی اور نیچے کو چل پڑی۔ ہم باہر آئے تو باہر موجود تمام لوگوں نے ہماری خیریت دریافت کی اور معذرت بھی کی۔

بس منیٰ کی طرف روانہ ہوئی۔ راستے میں اونچے نیچے مختلف رنگوں کے پہاڑ دکھائی دینے لگے۔ کوئی بالکل کالا، کوئی سرمئی، کوئی بھربھری مٹی جیسا۔ مجھے ایسے لگا جیسے یہ پہاڑ نہ ہوں بلکہ اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کے ساکت وجود ہوں یہ عبرت انگیز پیغام دے رہے ہوں کہ اے اللہ کے پیارے، پسندیدہ اور منتخب بندو!

کیا اس رتبے پر پہنچنے کے بعد بھی تم اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب کی نافرمانی کرو گے!!

بسیں منیٰ پہنچ چکی تھیں، ہم آسانی سے اپنے خیمے تک پہنچ گئے۔ نمازِ ظہر پڑھی اور آرام کے لیے لیٹ گئے کیونکہ رات کے بھی جاگے ہوئے تھے۔ کافی دیر بعد آصف نے ہمیں جگایا، ان کے ہاتھ میں کھانا تھا، آلو گوشت کے ساتھ روٹیاں لے کر آئے تھے۔ الحمدللہ۔ آدھے گھنٹے بعد باہر نکلی تو ساتھ والے خیمہ کے بنگالی نے روک لیا اور پوچھا کہ باجی، کھانا کھاؤ گی؟ پہلے تو میں نے انکار کر دیا، پھر سوچا کہ ذائقہ چکھتے ہیں۔ اس نے مجھے ایک ڈسپوز ایبل پلیٹ میں ابلے چاول، ان پر دال اور مچھلی کے دو ٹکڑے رکھ دیئے۔ جو سائز میں تقریباً چھ، چھ انچ کے تھے لیکن سالم مچھلی تھی اور اتنی مزیدار تھی کہ میں نے پہلے کبھی اتنی مزیدار فرائی مچھلی نہ کھائی تھی۔ نماز عصر ادا کرنے کے بعد نماز مغرب کی تیاری کرنے لگے۔ صبح نماز فجر کے بعد، یعنی منیٰ میں پانچ نمازیں ادا کرنے کے بعد ہم کو عرفات جانا تھا۔ ہم نے پیدل ہی جانے کا ارادہ کیا۔ آصف نے والدہ کے لیے وہیل چیئر لے لی۔ سوتے جاگتے رات گزاری۔ فرزانہ باجی نے رات گیارہ بجے ہی اٹھ کر تہجد پڑھ لی۔ تقریباً ایک بجے خیمے میں پھر ہلچل اور شور بلند ہوا۔ لوگ عرفات جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ پہلے منیٰ آنے کی جلدی تھی اور سات تاریخ کو ہی منیٰ آ گئے تھے اور اب عرفات جانے کی جلدی تھی۔ سنت کے مطابق پانچ نمازیں بھی ادا نہیں کر پائے۔ سردی میں اضافہ ہو گیا تھا، جسم کے اندر گھس رہی تھی۔ ہماری ہلکی چادریں سردی روکنے میں ناکام ثابت ہوئیں لیکن شاید صبر اور برداشت کا نام ہی حج ہے! بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ انہوں نے کھلے آسمان تلے رات گزاری یہ یہاں کے رہائشی ہوتے ہیں یا پھر غیر قانونی طور پر آئے ہوئے لوگ، جو پانچ دن منیٰ میں گزارتے ہیں اور مناسک حج پورے کر کے واپس چلے جاتے ہیں، بعض اوقات حج سے پہلے یا بعد میں گرفتار بھی ہو جاتے ہیں۔ اب علماء کرام نے اس طرح کا حج ممنوع قرار دے دیا ہے۔ فجر ادا کرنے کے بعد جب میدانِ عرفات جانے کے لیے نکلے تو یوں لگا، ساری دنیا ہی اس طرف رواں دواں ہے۔ خیال ہی نہ رہا کہ واپسی کے لئے کوئی نشانی رکھ لیں۔ واپسی پر اس خیمہ بستی کو پہاڑی علاقے میں ڈھونڈتے پھریں گے۔ چار ریال یعنی پاکستانی چونسٹھ روپے (اس وقت کے حساب سے) کی ہوائی چپل خریدی پھر راستے سے ہی فروٹ خریدا اور کھاتے پیتے .....

لبیک اللھم لبیک، لبیک لاشریک لک لبیک، ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک.....

کا ورد کرتے تقریباً گیارہ بجے مسجد نمرہ تک پہنچے۔ مسجد کے احاطے سے ملحقہ فٹ پاتھ کے بالکل ساتھ

جگہ مل گئی تو چٹائیاں بچھا کر بیٹھ گئے سورج کی تمازت کے سبب یہاں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا، اس کے علاوہ انسانوں کے ریلے ابھی بھی داخل ہو رہے تھے اور پھلانگ پھلانگ کر گزر رہے تھے۔ خیر، خود کو بچاتے بچاتے اور کچھ عبادت کرتے ہوئے خطبے کا وقت آن پہنچا۔ جمعہ اور عید کا خطبہ اکٹھا ہوا تو سننے میں بہت مزہ آیا۔ پھر دو فرض نماز ظہر اور دو فرض نماز عصر کے ادا کیے۔ نماز سے فراغت کے بعد فرزانہ باجی کہنے لگیں کہ پیچھے چلتے ہیں، پیچھے اصل میدان عرفات اور جبل رحمت ہے۔ وہاں وقوف کریں گے اور دعائیں بھی اطمینان سے مانگیں گے۔ ساتھ بیٹھے لڑکوں نے آصف سے کہا انکل یہیں ٹھہر جائیں، پیچھے بہت رش ہے اور آپ کے پاس وہیل چیئر ہے جس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا لیکن پھر بھی ہم چل پڑے۔ آگے بڑھے تو یوں لگا کہ گویا قیامت یہاں سے ابھی گزری ہے۔ حاجیوں کے احرام، ٹوٹی ہوئی وہیل چیئرز، پیٹیوں کے گتے، جو حاجی نیچے بچھا کر بیٹھے ہیں، چپلیں اور دیگر بکھرا ہوا سامان۔ آصف کو اپنی والدہ کو سنبھالنے میں بہت دقت ہو رہی تھی وہ کبھی وہیل چیئر ایک طرف سے اٹھاتے کبھی دوسری طرف سے، ہم نے کوئی بیس گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک گوشۂ عافیت میسر آ گیا اور ہم نے تقریباً دو گھنٹے وہاں کھڑے کھڑے دعائیں کیں، اس یقین کے ساتھ کہ یہ تمام دعائیں اللہ نے قبول کر لی ہیں۔ یہ یقین اللہ تعالیٰ اس خاص وقت میں امت محمدیہؐ کے دل میں ڈال دیتا ہے کہ تم مانگنے والے بنو، میں آج دینے بیٹھا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ رب نے دربار، میدان عرفات کے اوپر لگا رکھا ہے اور فرشتے آسمان سے قبولیت کے ٹوکرے برسا رہے ہیں۔ قسمت والے ہیں جو اس دن میدان عرفات سے خزانے لوٹ کر اور جھولیاں بھر کر نکلتے ہیں۔

غروب آفتاب کے وقت گولہ چھوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی حاجیوں نے میدان عرفات سے نکلنے کی تگ ودو شروع کر دی اور ہم بھی بخیر و عافیت مزدلفہ روانہ ہوئے جہاں مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی ادا کرنی تھیں۔ چل چل کے اور وہیل چیئر سنبھالتے آصف کافی تھک چکے تھے لہٰذا انہوں نے مجھ سے کہا کہ اب وہیل چیئر تم چلا لو۔ میں نے کوشش کی تو پتہ چلا کہ بظاہر آسان سا کام کتنا مشکل ہے، نہ چلا سکی۔ تو انہوں نے امی سے کہا کہ آپ تھوڑی دیر پیدل چل لیں، چنانچہ باقی خلقت کے ساتھ رواں دواں، رات گیارہ بجے ہم مزدلفہ پہنچ گئے۔ یہاں تِل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ کافی تگ ودو کے بعد ایک وہیل چیئر کے ساتھ آصف نے وہیل چیئر لگا دی اور آگے ہم نے اپنی چٹائی بچھا دی۔ ساری رات کبھی پڑھتے پڑھاتے، کبھی لوگوں کے لڑائی جھگڑے دیکھے، آنکھوں میں گزاری۔ صبح فجر سے پہلے کنکریاں چنیں۔ رات مغرب اور عشاء کی نمازیں

ادا کر کے جو وضو سنبھالا تو فجر بھی اس سے ادا کی کیونکہ پانی کے حصول کا کوئی تصور یہاں نہ تھا، نماز کے بعد منیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ منیٰ سے آتے ہوئے کوئی نشانی نہ رکھی تھی، لہٰذا واپسی میں راستہ بھٹک گئے، خیر اللہ کا نام لے کر اپنے خیمے میں پہنچے اور دیگر ضروریات سے فارغ ہو کر نماز ظہر ادا کی تو ہلنے کی بھی ہمت نہ رہی تھی۔ اب اگلی منزل رَمی جمرات تھی، آج صرف بڑے شیطان کو کنکریاں مارنی تھیں۔ لہٰذا آرام کیا اور فیصلہ ہوا کہ رَمی جمرات، عشاء کے بعد کریں گے۔ عشاء کے بعد رمی کے لیے چلنا شروع کیا تو ایسا لگا کہ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، عرفات کی طرح یہاں بھی راستہ طویل تھا مگر مشکل نہ تھا، تقریباً دو اڑھائی گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک بڑا سا ائیر پورٹ سا آ گیا، جہاں ہوائی جہازوں کی بجائے تین بڑے بڑے شیطان ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر نظر آئے جو شکل میں بیضوی تھے۔ جب بڑے شیطان کو کنکریاں ماریں تو جوش اور جذبہ اتنا زیادہ تھا کہ جیسے ہمارے اندر کا شیطان مجسم ہو کر سامنے آ گیا ہو، اور ہم اس کو ختم کر دینا چاہتے ہوں۔ اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر اتنے زور سے کنکری ماری کہ شیطان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ اسی جوش و جذبے سے پے در پے سات کنکریاں ماریں اور واپسی کے لیے مڑے۔ اللہ کا کرم ہوا کہ صحیح راستے پر رہے اور پاکستان ہاؤس کی مین کینٹین سے تقریباً دو دن کے بعد پیٹ بھر کے کھانا کھایا، چائے پی اور واپس خیمے میں آ کر لیٹ گئے۔

قربانی کے پیسے ہم نے مدرستہ صولتیہ میں جمع کروائے تھے، انہوں نے قربانی کا وقت ہمیں صبح گیارہ بجے، گیارہ ذی الحج کو دیا تھا۔ لہٰذا گیارہ ذی الحج کو ہمارا مختصر سا قافلہ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوا، تقریباً تین کلومیٹر تک چلنے کے بعد ویگن پر سوار ہو کر مکہ پہنچے۔ رہائش پر آ کر تھوڑا آرام کرنے کے بعد طوافِ کعبہ اور سعی کی، رات کو پھر واپس منیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک ویگن میں بیٹھے لیکن راستے میں ویگن رک گئی، معلوم ہوا کہ ٹریفک جام ہے۔ لہٰذا ہم وہیں اتر گئے تاکہ ہمارا وقت ضائع نہ ہو اور رمی جمرات کا راستہ پوچھنے کے بعد پیدل چلنا شروع کیا، دعائیں کرتے جاتے تھے کہ یا اللہ ہمارے اس پیدل سفر کو اور حج کو، اپنی بارگاہِ ایزدی میں قبول فرما لے۔ تقریباً بارہ بجے کے لگ بھگ رمی سے فارغ ہوئے، واپس منیٰ کی طرف سفر شروع کیا، رات دو بجے خیمے میں پہنچے۔ کل کا سفر پھر ذہن پر سوار تھا کہ حج کا کل آخری دن تھا۔ تیسرے دن ہم رمی کر کے، ایک اور راستے سے مکہ مکرمہ پہنچے جس کا دیگر حاجیوں سے پتہ چلا تھا۔ یہ راستہ چھوٹا بھی تھا اور آسان بھی، یہ ایک زیرِ زمین سرنگ تھی تقریباً ساڑھے تین کلومیٹر لمبی۔ اس میں چلتے ہوئے خوف تو بہت آیا لیکن تقریباً گیارہ بجے ہم اپنی رہائش پر تھے اور اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا حج مکمل

ہوگیا تھا۔اللہ کا شکر ادا کیا اور پاکستان سے بھی مبارک باد کے فون آنے لگے۔سب ہی بہت خوش تھے،شکر الحمدللہ! اللہ کریم سب مسلمانوں کو حج کا فریضہ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

☆☆☆

نوزائیدہ بچے کی دیکھ بھال

بچے کی پیدائش کے فوراً بعد بچے کے سر اور جسم کو نرم تولیے یا کپڑے سے اچھی طرح صاف اور خشک کر کے صاف چادر میں لپیٹ دیں۔ نوزائیدہ بچے کو مناسب گرمائش کی ضرورت ہے نئے ماحول سے ہم آہنگی کے لیے اسے کچھ وقت لگتا ہے۔

بچے کی آنکھیں اور ناک صاف گیلی روئی یا کپڑے سے صاف کریں۔

معمول کے مطابق بچے کو پیدائش کے فوراً بعد سانس لینا شروع کر دینا چاہیے۔ اس کا پہلا اظہار اس کے رونے سے ہوتا ہے۔ اس کے سانس کی رفتار باقاعدہ ہوتی ہے اس کی رنگت گلابی ہوتی ہے۔

تاہم اگر بچہ، ہلکی آواز میں روئے ، رک رک کر باقاعدگی سے سانس لے، اس کا رنگ نیلگوں یا پیلا ہو، تو اسے فوراً ہسپتال لے جائیں۔ بچے کا ناڑو صاف بلیڈ یا قینچی سے کاٹ کر صاف ڈوری سے باندھ لیں۔ بچے کے جسم پر لگا ہوا چپک دار مادہ رگڑ کر صاف نہ کریں صاف کپڑے سے نرمی سے صاف کر لیں۔

اگلا مرحلہ

بچے کو ماں کا دودھ پلانا فوراً شروع کر دیں۔

بچے کو کسی طرح کی گھٹی، عرق یا گرائپ واٹر دینے کی ضرورت نہیں۔ روایتی طور پر کسی بزرگ سے گھٹی دلوانا ہو تو ایک مرتبہ صاف انگلی سے تھوڑا سا شہد چٹانا کافی ہے۔

ماں کے دودھ کا ابتدائی حصہ ہرگز ضائع نہ کریں۔ اس لیے کہ یہ ایسے حفاظتی اجزا رکھتا ہے جو بہت سی بیماریوں سے بچے کو محفوظ رکھنے میں معاون ہیں۔ یہ دودھ بچے کا پیٹ صاف کر دیتا ہے۔ بچے کو ذہنی اور جسمانی آسودگی بخشتا ہے۔

بچے کو دودھ پلانے سے ماں کی بچہ دانی جلد معمول کی حالت پر آجاتی ہے اور ماں کا خون ضائع نہیں ہوتا۔

بچے کو نیم گرم پانی سے ہر روز غسل دیں تاکہ اسے صاف ستھرا رہنے کی عادت ہو۔

بچے کو ماں کے ساتھ سلائیں تاکہ اس کا جسم ماں سے ضروری حرارت حاصل کرتا رہے۔

بچے کے گیلے کپڑے جلد بدل لیجیے۔

بچے کے ناڑو پر کوئی دوا لگانے کی ضرورت نہیں۔

ناڑو سے پیپ نکلے یا مواد رسنے لگے تو فوراً ڈاکٹر کو دکھائیں اور ہدایات کے مطابق عمل کریں۔

بچے کی آنکھوں سے پانی رسنے لگے یا کوئی اور

تکلیف ظاہر ہوتو فوراً ڈاکٹر کو دکھائیں۔

بچے کو زیادہ سے زیادہ ماں کا دودھ دیں۔ پیدائش کے بعد ابتدائی چھ ماہ کے لیے صرف ماں کا دودھ دیں۔ بوتل ہرگز نہ شروع کروائیں۔ ابتدائی چھ ماہ کے دوران بچے کو کسی اضافی خوراک اور پانی کی ضرورت نہیں۔

بچے کو معمول کے مطابق حفاظتی ٹیکے لگوانے کا بندوبست کریں۔

بچے کو کسی بھی وقت اگر، سانس لینے میں دقت ہو، دورے پڑنے لگیں، دودھ پینے میں مشکل ہو، بخار ہو جائے، دست آنے لگیں، مسلسل قے ہونے لگے، یرقان ایک ہفتہ سے زیادہ دیر تک رہے، رنگت نیلی یا پیلی محسوس ہو، بازو ٹانگوں یا جوڑوں پر سوجن ہو جائے، ناڑو، آنکھوں یا جلد پر سوزش ظاہر ہوتو اسے فوراً مرکز صحت لے جائیں، مشکلات کی بر وقت نشاندہی اور علاج سے بچے کو جلد صحتیابی مل سکتی ہے۔

<u>بچے کو دودھ پلانے کا صحیح طریقہ:</u>

دودھ پلاتے ہوئے ماں کے سکون، اطمینان اور آرام دہ حالت سے بڑھ کر کوئی بات اہم نہیں۔ ماں بیٹھ کر، لیٹ کر جس طرح مناسب خیال کرے بچے کو دودھ پلائے۔ کسی معاملہ میں فکر، تشویش یا بے آرامی ماں کے دودھ پلانے کے عمل کو متاثر کر سکتی ہے۔ جس سے دودھ کی مقدار کم ہو سکتی ہے۔

بچے کو پورے اعتماد سے دودھ پلانا جاری رکھیں۔

اوپر کا دودھ ہرگز نہ لگائیں۔ چوسنی اور بوتل لگانے سے بچے کی بیماری کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔

بچے کو جب بھی بھوک محسوس ہو دودھ پلائیں زخم آنے کی صورت میں سب سے کارگر علاج ہے کہ اپنی پوزیشن آرام دہ کریں۔ بچے کو بار بار دودھ پلائیں تاکہ دودھ جمع نہ ہونے پائے۔ بچے کو دودھ پلانے کے بعد تھوڑا سا دودھ زخم پر لگائیں اور اسے ہوا میں خشک ہونے دیں۔

اگر چھاتی میں سوجن ہو جائے، درد ہو یا بخار ہونے لگے تو بچے کو دودھ پلانا جاری رکھیں تاہم مرکز صحت سے رجوع کرنے میں تاخیر نہ کریں۔

دودھ پلانے والی ماں کو اپنی غذائی ضروریات کی تکمیل کے لیے اپنی خوراک پر خصوصی توجہ دینی چاہیے ورنہ غذا میں کمی کے باعث وہ خون کی کمی اور ہڈیوں کی کمزوری کے عارضہ میں مبتلا ہو سکتی ہے۔

اسے چاہیے کہ وہ اپنے کھانے میں دودھ، پھل اور سبزیاں شامل رکھے۔ پانی زیادہ پیئے۔ فولاد اور کیلشیم کی اضافی گولیاں بچے کی پیدائش کے بعد چھ ماہ تک جاری رکھے۔ دن میں ایک دو گھنٹہ کا آرام اس کے جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے لازم ہے۔

یاد رکھیے آپ انسانیت کے لیے وہ عظیم خدمت سر انجام دے رہی ہیں جس کو یاد دلاتے ہوئے رب العالمین پوری انسانیت کو حکم دیتے ہیں کہ وہ آپ کے

لیے شکر گزار ہو۔ سورۃ لقمان میں ارشاد ہے:

ووصینا الانسان بوالدیہ ، حملتہ امہ وھنا علی وھن وفصلہ فی عامین ان اشکرلی ولوالدیک (لقمان ۱۴)

''ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے اس کی ماں نے اسے تکلیف پر تکلیف اٹھا کر رکھا اور پھر دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر اور اپنے والدین کا شکر بجالا۔''

☆☆☆

بتول میگزین

فارایور

(شمیم لودھی۔فیصل آباد)

شناختی کارڈ کی مدت ختم ہو چکی تھی۔اب جمع کروا کر نیا حاصل کرنا تھا۔مشکل کام تھا وقت نکالنا۔آخر ایک دن کوہِ نور پلازہ میں سب مراحل طے کرنے پڑے۔سارا عملہ منہ بسورتا ملا جیسے قبل از وقت جگا دیا گیا ہو۔فنگر پرنٹ لینے والا 26 سالہ لڑکا میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر خوب دبانے لگا print لینے کے لئے۔ مجھے بہت ناگوار لگا۔شاید اس کا موڈ ناشتہ نہ کر کے آنے پر اور نیند پوری نہ ہونے پر بگڑا ہوا تھا۔مگر اس میں میرا تو کوئی قصور نہ تھا۔برے تاثرات لئے ہوئے سیڑھیاں بمشکل اتر کر واپس آئی۔چند روز بعد شناختی کارڈ ملا۔لکھا تھا for ever (تاحیات) یہ دیکھ کر میں مطمئن ہوگئی ۔ حالانکہ مجھے یہ بھی گارنٹی نہ تھی کہ اگلا لمحہ اس دنیا میں ہوگا کہ نہیں۔ اب میں محاسبہ کرنے لگی اپنے سامان کا کہ دیکھوں۔یہی دکھائی دیا سب کچھ ہی forever ہے۔

ایک اہم شادی پر جانا تھا کئی ماہ قبل ہی سب تیاریوں میں مگن ہوگئے اور مجھے تیاری کا کہتے رہے۔ جوڑوں کا جائزہ لیا چند سال قبل تیار کروایا ہوا سوٹ نکالا جو 1300 میں بنا تھا اب تو 13 ہزار میں بنتا۔ بڑا بھاری کام تھا دوپٹے اور قمیض پر۔رات کو فنکشن میں پہنا بھلا لگا۔اتفاقاً میری سب ہم عمر نے وہی آف وائٹ رنگ پہنا ہوا تھا۔اسی طرح گرما بہار خزاں ہر موسم اور موقع محل کے جوڑے تیار۔جوتے دیکھے تو درجن سے زیادہ نکلے۔آج کل خیال تھا کہ یہ گھر بیچ کر نیا گھر لے لیں بڑا سا جہاں گھاس کا گراؤنڈ ہو پوتی کے لئے کھیلنے کے واسطے۔بغور دیکھا تو لگا کہ میرے لئے یہی گھر کافی ہے For ever! آپؐ سرور کونینؐ نے ہمیشہ اپنی بے سروسامانی پر ناز کیا۔ اور ہم کوتاہ عقل اپنے ساز وسامان پر ناز کرتے ہیں۔آپؐ رسول کریم کی عمر مبارک 63 سال تھی۔اس لیے مجھے لگتا ہے ان کے جس امتی کی عمر 63 سال کے اوپر ہو سمجھے اسے bonus مل رہا ہے ہر لمحہ، ہر ساعت دین کی سربلندی کے لیے وقف کر دے جو اگلی دنیا میں ہمارے ساتھ جائے گا۔کارڈ، جوڑے، کمرے، گھر سب یہیں رہے گا، میرے کس کام کا!!

☆☆☆

دست دعا

مریم فاروقی

ہمیں اپنی اب تک کی زندگی میں بہت سارے مرحلے پیش آئے بہت جگہ بے وقوفی کے کام سرزد

ہوئے ...... اور بعض جگہ نا سمجھی سے بھی غلط رویے اور غلط کام کر گزرے لیکن کسی کو ہماری یہ حماقتیں اور نالائقیاں محسوس تک نہ ہوئیں یا کسی نے ہمیں جتایا تک نہیں بلکہ ہمارے اردگرد کے لوگ ہمیں یا تو اپنی دانست میں یا ہماری دانست میں دانش ور سمجھتے رہے۔ یا ہم ہی اس خوش فہمی میں رہے۔ بہرحال اللہ نے عزت و آبرو سلامت رکھی۔ آئندہ بھی اللہ مہربانی ہی کیے رکھے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس عزت اور سربلندی میں سارا کردار ہماری دعاؤں کا ہے جو ہم نے بچپن میں دعاؤں کی کتابوں سے یا اپنی والدہ محترمہ سے بچپن میں یاد کیں تھیں۔ ان کے ذوق میں ہمیں یہ حصہ ملا کہ جو اچھی کتاب دیکھی جھٹ پڑھ ڈالی...... چاہے دعاؤں کی ہو یا کہانیوں کی مضمون طرز کی ہو یا نظم و نثر میں بس کچھ ان سے چھپ کر کچھ علمیت کا رعب رکھنے کے لیے اس کا فائدہ آج اٹھا رہے ہیں۔ جب صورت حال ایسی ہو تو پھر کتابی بندے کو کتابوں کے علاوہ اور کسی سے کیا سروکار۔ جب عملی دنیا میں قدم رکھا تو ہر چیز حیرت ناک نظر آئی۔

کھانا بناتے وہ بھی انوکھا نندیں چپکے چپکے ساس امی کو کہتیں یہ بھلا کوئی کھانے والا سالن ہے ہم نہیں کھاتے۔ ہم دل ہی دل میں **اللھم استر عوراتنا وآمن روعاتنا** ''اے اللہ ہمارے عیبوں کو چھپا لے اور خوف کی چیزوں سے امن دے'' کا ورد کرتے۔ نتیجہ کسی تلخی کے بغیر ہی امان مل جاتی۔ اسی طرح سسرال یا میکہ میں کوئی بات ایسی منہ سے نکل جاتی جس سے ڈر ہوتا کہ اگر نشر ہو گئی تو بڑی گڑبڑ ہو سکتی ہے تو فوراً **اللھم انی اعوذبک من شر ما عملت اعوذبک من شر ما لم اعمل** ''اے اللہ کردہ اور نا کردہ کاموں کے شر سے بچا۔'' ایسے امن ملتا تھا گویا کہ ہوا ہی کچھ نہیں! جب کاموں کا بوجھ سر پہ سوار ہو جاتا جسم تھک کر ساتھ دینے سے جواب دے دیتا چپ کر کے کمرے میں خاموشی سے لیٹ کر آرام سکون سے ۲۰ یا ۳۰ بار **یا حی یا قیوم برحمتک استغیث** پڑھنے سے طبیعت تازہ دم ہو جاتی اور جسم بھی کام کے لیے تیار ہو جاتا۔ جب میکہ یا سسرال میں کوئی ایسی بات پیش آتی کہ سمجھ میں ہی نہ آتا کہ کیا بولیں کہ ہماری بات سے معاملہ سلجھے، بگڑے نہیں پھر یہ دعا سہارے کے لیے موجود ہوتی۔ **اللھم اھدنی وسددنی** ''اے اللہ میری راہنمائی کر اور مجھے سیدھا رکھ۔''

اگر کاموں کا ہجوم ختم ہونے میں نہ آتا تو یہ دعا ساتھ دیتی رہی کہ نبی کریمؐ کے فرمان کے مطابق اس کو پڑھنے والے کے کام اللہ اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ **حسبی اللہ لا الہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم** فٹ سات بار اس دعا کو دہرانے سے کام ایسے سمٹنے شروع ہوتے کہ بس جھٹ پٹ سب کاموں سے فارغ!

اسی طرح کسی بات پر میاں کی ناراضی سے دل ڈرا خاموشی سے یا حیی یا قیوم اور حسبنا اللہ نعم الوکیل کے ورد نے نا صرف ڈانٹ سے بچا یا بلکہ بعض اوقات پذیرائی بھی دلوا دی کم از کم بے آبروئی سے بچت تو لازمی ہوئی۔

الغرض کیا کہوں دعاؤں کی برکت سے زندگی ایسی خیر خیریت سے اب تک گزر رہی ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ مجھ جیسی ناسمجھ اور بے وقوف لڑکی نے کامیابی کے ساتھ عملی زندگی کے تیرہ چودہ سال گزار لیے۔ یہ سب دعاؤں کی برکت اور اللہ کی مہربانی کا کمال ہے آج بھی نبی کریمؐ کی بتائی ہوئی دعائیں روزمرہ زندگی میں پہلے سے زیادہ اثر پذیری کے ساتھ اور زیادہ عملی پہلوؤں میں رہنمائی اور دستگیری کا کردار ادا کر رہی ہیں۔ اللہ سے امید ہے کہ اس کے ساتھ اس رابطے کی بدولت ان شاء اللہ باقی مرحلے بھی آسانی سے طے ہو جائیں گے۔

☆☆☆

تاریخ کی گواہی

ام صائم۔ لاہور

نبیؐ کی زندگی سے غیر مسلموں نے تو فائدہ حاصل کر لیا اور امت مسلمہ صرف اس گمان کے ساتھ زوال پذیر ہو رہی ہے کہ ہم نے کلمہ پڑھ لیا نبیؐ کا اور عاشقی کا دعویٰ کر لیا تو کافی ہے اور اب جنت ہم پر واجب ہے۔

اور جس قرآن کو ہم نے برکت کی کتاب سمجھ کر الماریوں میں سجا دیا اس کا پیغام ہے کہ اگر اللہ کی محبت چاہتے ہو تو نبیؐ کی اتباع و اطاعت کرو۔

نبیؐ کی پوری زندگی اخلاق کی بلندیوں پر ہے جو کوئی آج کامیاب ہونا چاہتا ہے خواہ زندگی کے کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو تو اس کے لیے نبیؐ کی سیرت کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''اگر دولت مند ہے تو مکے کے تاجر کو دیکھے۔ غریب ہے تو شعب ابی طالب میں محصور اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت دیکھے۔ بادشاہ ہے تو سلطان عرب کا حال پڑھے۔ استاد ہے تو صفہ کی درسگاہ کے معلم کو دیکھے۔ شاگرد ہے تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر ڈالے۔''

معلم و مربی نبی محترم کے گھر کا منظر۔

''ایک طرف جو کی روٹی، کھجور کی چٹائی، تھوڑے سے جو جسم پر کھجور کی چٹائی کے نشان اور جسم مبارک پر ایک تہبند، تین تین چاند گزر جاتے کہ گھر میں چولہا نہ جلتا صرف کھجور اور پانی پر زندہ۔''[1]

یہ وہ وقت تھا کہ جب آپ کی فوجیں دنیا کو فتح کر رہی تھیں۔ جزیرۃ العرب کے اندر سے مالِ غنیمت مختلف فتوحات کے نتیجے میں دارالخلافہ مدینہ کی طرف دریاؤں کے دھاروں کی طرح بہہ رہا تھا تو حضورؐ نے دنیا اور اس سروسامان کو خود دھتکار رکھا تھا۔

''ایک قوم کو جو چیز زندہ رکھتی ہے اُسے طاقتور اور سربلند بناتی ہے وہ اس کے مکان، لباس، سواریاں، اسبابِ بیش یا فنونِ لطیفہ نہیں بلکہ وہ اصول ہیں جن پر اس کی تہذیب قائم ہوتی ہے......یعنی اصول کی صحت، ان پر پختہ ایمان اور عملی زندگی میں ان کی کامل فرمانروائی۔''[۲]

یہ ۱۹۷۳ء کی بات ہے جب عرب اسرائیل جنگ چھڑنے کو تھی۔ ایک امریکی سینیٹر جو اسلحہ کمپنی کا سربراہ تھا ایک اہم کام کے سلسلے میں اسرائیل کی وزیراعظم گولڈا مائیر کے پاس لایا گیا تو اس وزیراعظم نے ایک گھریلو عورت کی طرح اس کا استقبال کیا۔ کچن میں بٹھایا، چائے کی پیالی بنائی، دھوئی، اپنی جگہ پر رکھی۔ اس دوران طیاروں، میزائلوں اور توپوں کا سودا کر لیا اور تحریری معاہدے کے لیے اُسے اپنے سیکرٹری کے پاس بھجوانے کے لیے کہا۔

یہ سودا اتنا بڑا تھا کہ اسرائیلی کابینہ نے خود اُسے رد کر دیا کیونکہ اس کے بعد اسرائیلی قوم کو برسوں تک دن میں ایک وقت کے کھانے پر اکتفا کرنا پڑتا۔ گولڈا مائیر نے ارکانِ کابینہ کا موقف سنا اور کہا ''آپ کا خدشہ درست ہے لیکن اگر ہم جنگ جیت گئے، عربوں کو پسپا کر دیا تو تاریخ ہمیں فاتح قرار دے گی اور کوئی یہ نہیں دیکھے گا کہ اس دوران کتنی بار کھانا کھایا، ان کے جوتوں میں کتنے سوراخ تھے یا ان کی تلواروں کے نیام پھٹے پرانے تھے۔''

فاتح صرف فاتح ہوتا ہے اور آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ گولڈا مائیر کا اقدام درست تھا اور عربوں پر انھوں نے فتح حاصل کی۔ جنگ کے ایک عرصے کے بعد واشنگٹن کے نمائندے نے گولڈا مائیر سے سوال کیا کہ امریکی اسلحہ خریدنے کے لیے آپ کے ذہن میں دلیل کہاں سے آئی۔ گولڈا مائیر کا جواب چونکا دینے والا تھا کہ جب اُس نے کہا کہ ''میں نے یہ استدلال اپنے دشمنوں کے نبی محمدؐ سے لیا تھا کہ جب وہ فوت ہوئے تو ان کے گھر تیل نہیں تھا کہ دیا جلا سکیں۔ لیکن دیوار پر نو تلواریں لٹک رہی تھیں۔ میں نے جب کالج کے زمانے میں یہ پڑھا تو سوچا کہ مسلمانوں کی پہلی ریاست کی کمزور اقتصادی حالت کے بارے میں تو لوگ اتنے نہیں جانتے ہوں گے جتنا یہ جانتے ہیں کہ مسلمان آدھی دنیا کے فاتح بنے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ اگر مجھے اور میری قوم کو برسوں بھوکا رہنا پڑے، پختہ مکانوں کی بجائے خیموں میں زندگی بسر کرنا پڑے تو بھی اسلحہ خرید کر خود کو مضبوط کریں گے اور فاتح کا اعزاز پا لیں گے۔''

پھر گولڈا مائیر کا انٹرویو لینے والے نے مزید کہا کہ میں نے اس واقعہ کے بعد تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا تو عرب بدوؤں کی حکمت عملی دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ۷۲،۷۲ گھنٹے ایک چھاگل پانی اور سوکھی روٹی کے چند

ٹکڑوں پر گزارا کرتے تھے اور میں قائل ہو گیا کہ تاریخ
فتوحات گنتی ہے دسترخوان پر رکھے انڈے، جیم، مکھن
نہیں۔[۳]

([۱،۲،۳] حدیث پر عمل کیسے از یاسمین حمید)

☆☆☆

حجاب اور کارپوریٹ اخلاقیات

دنیا بھر میں کسی بھی روشن خیال مفکر، جمہوریت پسند دانشور، حقوق انسانیت کے علمبردار سماجی کارکن یا سیکولر سیاسی رہنما کو انسانی ترقی، معاشی خوشحالی اور تہذیبی ارتقاء پر گفتگو کرتے دیکھیں تو ان سب کی نفرت کا نشانہ صرف ایسی عورت بنتی ہے جو لوگوں کی ہوسناک نظروں اور لاشعور میں مچلتے غلیظ خیالات کی زد سے بچنے کے لئے اپنے چہرے اور جسم کو ڈھانپ کر باہر نکلتی ہے۔ میں ایک مرد ہوں اور میں ان تمام ''مردانِ حر'' کی نظروں میں چھپی ہوس کو بخوبی جانتا ہوں جو کسی کم لباس خاتون کو بازار میں، کسی ماڈل کو فیشن شو میں، کسی گلوکارہ کو سٹیج پر یا کسی جاذبِ نظر خاتون کو دفتر کے استقبالیہ کاؤنٹر پر دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ میں ان کے ان غلیظ جملے اور فقرے بھی تحریر کرسکتا ہوں لیکن میں سعادت حسن منٹو نہیں کہ مجھے آزادئ اظہار کے نام پر معاشرے میں صرف جنس ہی نظر آئے۔ مردوں کی نظروں کی یہ ہوسناکی، ان کی فقرے بازی اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے سنگین جرائم میرے ملک تک محدود نہیں بلکہ دنیا کے ہر ترقی یافتہ ملک میں خطرناک حد تک پائے جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں دوپٹہ گلے سے سرکنے پر آنکھیں پھسلتی ہیں اور مغرب میں مختصر ترین لباس مردوں کی گردنیں موڑتا ہے۔ کبھی کسی نے سوچا ہے کہ حقوق کی کہانی کی ساری تان عورت کو گھر کی چاردیواری سے باہر لاکر محفل کی زینت بنانے پر کیوں ٹوٹتی ہے؟ آپ کسی بھی مفکر، دانشور، جمہوریت پسند انسانی حقوق کے ترجمان سے مل لیں، اسے اس بات پر کبھی اعتراض نہیں ہوگا کہ آپ نمازیں پڑھیں، روزے رکھیں، حج کریں، زکوٰۃ دیں، داڑھی رکھیں، ٹخنوں سے اونچی شلوار پہنیں، دن رات قرآن کی تلاوت کریں..... لیکن جونہی کوئی خاتون اپنی اولاد کی تربیت اور گھر جیسے بنیادی ادارے کی دیکھ بھال کے لئے اپنے آپ کو وقف کرتی ہے تو انگلیاں اٹھنا شروع ہوجاتی ہیں۔ پڑھ لکھ کر برباد کررہی ہے، فرسودہ، دقیانوس، ترقی کی دشمن! لیکن سب سے زیادہ غصہ اس خاتون پر آتا ہے جو باہر تو آجاتی ہے لیکن چہرہ اور جسم ڈھانپ کر نکلتی ہے۔

کیا یہ ایک مذہبی مسئلہ ہے؟ اگر یہ مذہبی مسئلہ ہوتا تو سب سے پہلے عیسائی راہبائیں (Nuns) اس نفرت کا شکار بنتیں۔ لیکن چونکہ انہوں نے حجاب کے لئے ترکِ دنیا کی شرط رکھ دی ہے اور باقی معاشرے کو کھلی چھوٹ دے دی ہے اس لیے گوارا ہے کہ چلو کتنی عورتیں

راہبائیں بن جائیں گی۔لیکن اگر حجاب معاشرے میں عام ہوجائے تو بڑا طوفان آئے گا، اس لیے کہ حجاب کے مقبول ہونے کی ایک بنیادی نفسیاتی وجہ ہوتی ہے۔ دنیا میں تمام نفسیاتی ماہرین اور معاشرتی محقق اس بات پر متفق ہیں کہ عورت سب سے زیادہ نفرت اور حقارت کسی غیر مرد کی آنکھوں کی ہوسنا کی اور بے حیائی سے کرتی ہے۔عریاں ترین لباس والی عورت بھی، اگر وہ جنسی کاروبار کے لیے بازار میں نہ کھڑی ہوتو اسے بھی مردوں کی غلیظ نظروں سے نفرت ہوتی ہے۔مردوں کی نظروں کی ہوسنا کی اور عورتوں کی بے حجابی کے درمیان جو رشتہ قائم ہوتا ہے اس سے دنیا میں کئی سو بلین ڈالرز کا کاروبار چلتا ہے۔عریانی کا تحفظ اسی کاروبار کی بقا کی جنگ ہے۔ یہ کاروبار آرائشِ حسن کے ساز وسامان سے شروع ہوکر فیشن انڈسٹری، میڈیا، ایڈورٹائزنگ اور لباس کی مخصوص تراش خراش کے فن سے ہوتا ہوا مکروہ ترین فحش فلموں اور بدن فروشی کے عالمی مافیا تک جا نکلتا ہے۔آپ ذرا اس پوری انڈسٹری کا جائزہ لیں تو آپ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ جائیں۔ صرف سر کے بالوں کو سنوارنے کے لئے سیکڑوں ملٹی نیشنل کمپنیاں شیمپو سے لے کر بال سیدھا کرنے، رنگ کرنے، گھنگھریالے بنانے اور ان کو جاذبِ نظر بنانے کے لئے طرح طرح کی ادویات اور لوشن بنا رہی ہیں۔ اگر ٹانگیں اور بازو دکھانا مقصود ہوں تو ان کی خوبصورتی اور دلکشی کے لئے علیحدہ ساز وسامان بنانے والی کمپنیاں اپنا کاروبار پھیلائے ہوئے ہیں۔ غرض پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک کوئی مقام ایسا نہیں جسے کاروبار کا موضوع نہ بنایا گیا ہو اور اسے بازار میں لا کر نہ کھڑا کیا گیا ہو۔اس سارے کاروبار کو میڈیا کی چکا چوند اور فیشن شوز کی بھرمار اور ماڈلز کی جسمانی ہیت اور ان کے خدوخال کو دنیا بھر کی عورتوں کے لئے آئیڈیل بنا کر پیش کرنے سے مضبوط اور مستحکم کیا جاتا ہے۔کبھی سائز زیرو آئیڈیل ہوتا ہے اور چند سالوں بعد بھرے ہوئے جسم کی تعریفوں میں اخبارات کے صفحے کالے ہوتے ہیں۔ ان سب کی معراج عالمی مقابلۂ حسن ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جس سال مغربی ممالک میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوا، اس کے اگلے سال یعنی 1921ء میں امریکہ کے اٹلانٹک سٹی میں یکم مئی کے ساتھ دو ہفتہ وار چھٹیاں بھی مل گئیں۔لوگوں کو مصروف رکھنے کے لئے ہوٹل کے مالکان نے تیراکی کے لباس میں ملبوس خواتین کا مقابلہ کروایا اور ایک خاتون کے سر پر ملکۂ حسن کا تاج پہنا دیا گیا۔اس دن سے لے کر آج تک جنگ ہو، بدحالی ہو، سیلاب یا زلزلہ ہو، مقابلۂ حسن نہیں رُکا۔1951ء میں برطانیہ کے ایرک مورے نے اسے قواعد وضوابط والا مقابلہ بنایا۔ دنیا کے ہر خطے سے مخصوص مفادات کے تحت ملکۂ حسن منتخب کی گئی اور پھر ہر خطے کی خواتین کو اس نمائش کی دوڑ

میں مدہوش کردیا گیا۔ بھارت میں جس سال ایشویارائے اور سشمیتا سین ملکۂ عالم اور ملکۂ دنیا کا اعزاز جیتیں، پورے بھارت میں صرف تین پلاسٹک سرجن تھے،صرف دوسال بعدان کی تعداد پانچ سوہوگئی اورآج ان کی تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے۔

ایک دفعہ خواتین کو زینتِ بازار بنانے کے بعد پورے معاشرے میں جو ہیجان پیدا ہوتا ہے، مردوں میں جنسی محرکات پیدا ہوتے ہیں ان کو آگ دکھانے اوراس کاروبار کو وسیع تر کرنے کے لئے فحش مواد کی ایک بہت بڑی انڈسٹری وجود میں لائی گئی۔جس سے ہرسال70ارب ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے۔ان میں سے 15ارب ڈالرصرف امریکہ سے کمائے جاتے ہیں۔ سالانہ20ارب ڈالرصرف فحش فلموں کی فروخت سے حاصل ہوتے ہیں، آٹھ ارب ڈالرفحش رسالے اورمیگزین بیچ کر حاصل کیے جاتے ہیں۔انٹرنیٹ پر فحش سائٹس سے تین ارب ڈالرکمائے جاتے ہیں۔ان میں سب سے مکروہ دھندہ13سال سے کم عمر بچیوں کی تصاویراورفلموں کا ہے جس سے تین ارب ڈالرکمائے جاتے ہیں اوراس وقت انٹرنیٹ پران کی ایک لاکھ کے قریب ویب سائٹس ہیں جبکہ باقی فحش سائٹس کی تعداد 45لاکھ اورفحش انٹرنیٹ پیجز کی تعداد تین کروڑ 75لاکھ ہے۔صرف امریکہ کی تین لاکھ 25ہزار بچیاں ان فحش تصویروں اورفلموں کے لئے اپنے جسم کی نمائش کرتی ہیں۔ اس دھندے سے جو ہیجان پیدا ہوتا ہے اور عورت کی ہر مقام پر عریاں موجودگی جس طرح ان معاشروں کے بھیڑیوں کو ہوس کے بازار میں لاکھڑا کرتی ہے، وہیں سے جسم فروشی کا دھندہ کبھی مساج پارلروں کی شکل اور پھر کہیں (Escort) سروس کے نام پر پوری دنیا میں عام ہوتا ہے۔ پوری دنیا کے غریب ممالک سے لاکھوں کی تعداد میں کم عمر بچیوں اورعورتوں کوان مساج پارلروں اورطوائف گھروں میں لا بٹھایا جاتا ہے جن کی نگرانی تنومند غنڈےاورتربیت یافتہ کتے کررہے ہوتے ہیں۔ جنگ، بھوک، بیماری اورافلاس زدہ علاقوں کی لڑکیاں بھی اس کاروبار میں جھونکی جاتی ہیں۔ جہاں کہیں ورلڈکپ یا کسی اورطرح کا عالمی اکٹھ ہوتا ہے ایسی عورتوں کا ایک سیلاب وہاں پہنچا دیا جاتا ہے۔اس ساری صورت حال سے جو معاشرہ جنم لیتا ہےاس میں ہرایک سیکنڈ میں دوخواتین جنسی تشدد کا شکار ہوتی ہیں، پوری دنیا میں ہزاروں سیریل کلر یعنی جنونی قاتل جنم لیتے ہیں جوعورتوں کواغوا کرکے جنسی تشدد کے بعدقتل کرتے ہیں۔ ہرسال دس لاکھ بچے صرف امریکہ میں کم سن لڑکیاں جنم دیتی ہیں جو بغیرشادی کے پیدا ہوتے ہیں اوران میں اکثریت خیراتی اداروں کے سپرد ہوجاتی ہے۔ ایک ہولناک اور بھیانک تصویر ہے جو دفتروں میں جنسی طور پر ہراساں کرنے سے شروع ہوتی ہے اورپُرتشدد قتل

وغارت تک جاتی ہے۔لیکن ان سب سے کئی سو ارب روپے کی انڈسٹری چلتی ہے۔اسی لیے جو عورت حجاب پہننے کا اعلان کرتی ہے وہ اس اربوں ڈالر کی آمدنی کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔وہ نمائش نہیں بننا چاہتی جو اس سرمایہ کمانے کے چکر کا آغاز ہے۔ایسی مخالفت کو آغاز میں ہی کچلنے کے لیے یہ اخلاقیات سے محروم سرمایہ دار حقوقِ نسواں، جمہوری اقدار اور معاشرتی ترقی کے تیر ہاتھوں میں لیے حملہ آور ہوتے ہیں۔ایسی آواز کو دبانے کے لئے جو ان کے پیٹ پر لات مارنا چاہتی ہے۔

(عالمی یومِ حجاب کے حوالے سے خصوصی تحریر)

☆☆☆